لاهور احمدیه انٹرنیشنل سه ماهی نیوز گزٹ

پیغامِ صُلح

سالانہ دعائیہ دسمبر 2005ء کے دوران دوروزہ بین الاقوامی مشاورتی کمیٹی کے اجلاس کے بعد انڈونیشیا، فجی، تھائی لینڈ، کینیڈا، انگلستان اور پاکستان کی مختلف جماعتوں کے مندوبین حضرت امیر ڈاکٹر عبدالکریم سعید صاحب ایداللہ تعالیٰ کے ہمراہ صالحہ ظہور احمد میموریل لائبریری، نیو گارڈن ٹاؤن لاہور کے باہر

ناشر: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام (لاہور) یو کے
پتہ: 15- سٹینلے ایونیو' ویمبلے ۔ ایچ اے او' 4- جے کیو' لنڈن انگلستان

بانی سلسلہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام نے تحریک میں شمولیت کے لئے ذیل کے شرائط مقرر کئے:

دس شرائط بیعت

۱ بیعت کنندہ سچے دل سے عہد اس بات کا کرے کہ آئندہ اس وقت تک کہ قبر میں داخل ہو جائے شرک سے مجتنب رہے گا۔

۲ یہ کہ جھوٹ اور زنا اور بد نظری اور ہر ایک فسق اور ظلم اور خیانت اور فساد اور بغاوت کے طریقوں سے بچتا رہے گا اور نفسانی جوشوں کے وقت ان کا مغلوب نہیں ہو گا اگرچہ کیسا ہی جذبہ پیش آوے۔

۳ یہ کہ بلاناغہ پنجوقتہ نماز موافق حکم خدا اور رسولؐ کے ادا کرتا رہے گا اور حتی الوسع نماز تہجد کے پڑھنے اور اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے اور ہر روز اپنے گناہوں کی معافی مانگنے اور استغفار کرنے میں مداومت اختیار کرے گا اور دلی محبت سے اللہ تعالیٰ کے احسانوں کو یاد کر کے اس کی حمد اور تعریف کو ہر روز اپنا ورد بنائے گا۔

۴ یہ کہ عام خلق اللہ کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اپنے نفسانی جوشوں سے کسی نوع کی ناجائز تکلیف نہیں دے گا۔ نہ زبان سے نہ ہاتھ سے نہ کسی اور طرح سے۔

۵ یہ کہ ہر حال رنج اور راحت اور عسر اور یسر اور نعمت اور بلا میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کرے گا اور بہر حالت راضی بقضا ہو گا اور ہر ایک ذلت اور دکھ کے قبول کرنے کے لئے اس کی راہ میں تیار رہے گا اور کسی مصیبت کے وارد ہونے پر اس سے منہ نہیں پھیرے گا بلکہ آگے قدم بڑھائے گا۔

۶ یہ کہ اتباع رسم اور متابعت ہوا و ہوس سے باز آئے گا اور قرآن شریف کی حکومت کو بکلی اپنے سر پر قبول کرے گا اور قال اللہ اور قال الرسول کو اپنی ہر راہ میں دستور العمل قرار دے گا۔

۷ یہ کہ تکبر اور نخوت کو بکلی چھوڑ دے گا اور فروتنی اور عاجزی اور خوش خلقی اور حلیمی اور مسکینی سے زندگی بسر کرے گا۔

۸ یہ کہ دین اور دین کی عزت اور ہمدردی اسلام کو اپنی جان اور اپنے مال اور اپنی عزت اور اپنی اولاد اور اپنے ہر ایک عزیز سے زیادہ عزیز تر سمجھے گا۔

۹ یہ کہ عام خلق اللہ کی ہمدردی میں محض للہ مشغول رہے گا اور جہاں تک بس چل سکتا ہے اپنی خدا داد طاقتوں اور نعمتوں سے بنی نوع کو فائدہ پہنچائے گا۔

۱۰ یہ کہ عاجز سے عقد اخوت محض للہ باقرار طاعت در معروف باندھ کر اس پر تا وقت مرگ قائم رہے گا اور اس عقد اخوت میں ایسا اعلیٰ درجہ کا ہو گا کہ اس کی نظیر دنیوی رشتوں اور تعلقوں اور تمام خادمانہ حالتوں میں پائی نہ جاتی ہو۔

("ازالہ اوہام" از حضرت مرزا غلام احمد قادیانی، بانی سلسلہ احمدیہ صفحات ۸۵۳، ۸۵۴-۱۸۹۱ء)

ناشر: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام (لاہور) یو ایس اے

پتہ: ۱۳۱۵ کنگز گیٹ روڈ، کولمبس، اوہائیو ۱۵۰۴-۴۳۲۲۱ (یو ایس اے)

مدیران: ناصر احمد - شاہد عزیز

مئی ۲۰۰۶ء

اس شمارے میں

انگریزی سے ترجمہ

قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کی نظرثانی کے سلسلہ میں

محمد مارماڈیوک ولیم پکتھال کی جامعۃ الازہر کے علماء سے بحث و تمحیص کی تفصیل

از حافظ خورشید احمد - ایم اے

(ہمارے عزیز دوست حافظ خورشید احمد صاحب تدریس کے شعبہ سے منسلک ہیں۔ محمد مارما ڈیوک پکتھال، معروف مترجم قرآن مجید انگریزی کا ترجمہ ''دا میننگ آف دا گلوریس قرآن'' (The Meaning of the Glorious Qur'an) کے نام سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا۔ حافظ صاحب کو ان کی اسلامی خدمات کی تحقیق کا شوق ہم تک لے آیا اور اس طرح اس سلسلہ میں تعلقات بڑھتے گئے۔ انہی کی نشاندہی پر اس نومسلم عالم اور مفکرِ اسلام کی زندگی کے بارے میں کتاب ''لائل اینمی'' (Loyal Enemy) یعنی وفادار دشمن، کے مطالعہ کا موقع ملا جس سے پکتھال صاحب کے بچپن سے لے کر وفات تک کے حالات کی تفصیلات کا پتہ چلا۔ اس کتاب سے ان کے انگریزی ترجمہ قرآن کے بارے مین قاہرہ میں جامعۃ الازہر کے علماء سے ان کی بحث و تمحیص کی تفصیلات تک رسائی بھی حاصل ہوئی۔ کتاب مذکورہ ان کی ایک عزیزہ این فری مینٹل (Anne Freemantle) نے لکھی تھی۔ لیکن حافظ خورشید احمد صاحب جو پکتھال کے متعلق تحقیق میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ وہ پکتھال صاحب کے متعلق ایک مبسوط تحقیقی مقالہ لکھیں۔ انہیں خود پکتھال کے قلم سے لکھا ہوا ایک مضمون مل گیا جو رسالہ ''اسلامک کلچر'' (Islamic Culture)، حیدر آباد دکن کے جولائی ۱۹۳۱ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے ان مشکلات اور مصر کے علماء کے قرآن مجید کے دیگر زبانوں میں ترجمہ کے متعلق شکوک اور شبہات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور یہ کہ ان کو دور کرنے کے لئے انہوں نے کس طریق پر کوشش کی اور پھر اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس کی تفصیل بھی درج کی ہے۔ اس انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ اور ان کے مختصر حالات زندگی جو حافظ خورشید احمد صاحب نے کمال مہربانی سے شائع کرنے کے لئے دیئے ہیں شاملِ اشاعت کئے جا رہے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ حافظ صاحب کی یہ پرخلوص کوشش بار آور ثابت ہوتا کہ اس برطانوی مسلمان عالم اور مترجم قرآن مجید کی دینی خدمات کا مبسوط طور پر لوگوں کو علم ہو سکے۔ ادارہ)

مختصر حالات زندگی

محمد مارما ڈیوک ولیم پکتھال ۷/ اپریل ۱۸۷۵ء کو انگلستان میں سفوک، چیلس فورڈ گرجا کے ریکٹر چارلس پکتھال کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ نے مشہور تعلیمی ادارہ ہارو پبلک سکول سے تعلیم حاصل کی۔ مشرقِ وسطیٰ کے مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے مطالعہ کے شوق کی وجہ سے آپ نے فلسطین کا رخ کیا۔

مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں ایک لمبا عرصہ قیام پذیر رہنے کی وجہ سے آپ کو عربوں، خاص طور پر مسلمانوں کے طرزِ زندگی اور عربی زبان کا براہِ راست مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ انگلستان میں قبولِ اسلام سے قبل انہوں نے مشرقِ وسطیٰ کے معاشرتی اور سیاسی حالات اور مسائل کے بارے میں کئی ناول لکھے جو بے حد مقبول ہوئے اور اس طرح ان کو اس لحاظ سے ایک خاص مقبولیت حاصل تھی۔ آپ کے ناولوں میں سے ''سعید ملاح'' کا شمار انگریزی کے کامیاب ترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۹۰۳ء میں ہوئی۔ اس ناول میں انہوں نے شام کی ایک رومانوی کہانی کو موضوع بنایا تھا۔ اس ناول نے پکتھال کے نام کو انگلستان کے ادبی حلقوں میں ایک معتبر حیثیت کا حامل بنا دیا۔ جن معروف رسائل و اخبارات میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے ان میں ٹمپل بار، بلیک وڈ میگزین، کارن ہل میگزین، لغلو لونگ ایج، دا ٹائمز، سیچر ڈے ریویو، دا نیو ایج، دی ایتھی نائم اور دا کرائسٹ شامل ہیں۔ تقریباً تین برس تک ہندوستان کے نامور اخبار ''بمبئے کرانیکل'' کے مدیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس دوران ان کو تحریک خلافت

کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دینے کا بھی موقع ملا اور ساتھ ہی ان پر ہندوستان کی سیاست کے بارے میں حکومت برطانیہ کی درپردہ سیاسی منصوبہ بندیوں کی اصل حقیقت کا انکشاف بھی ہوا۔

۱۹۱۷ء میں قبول اسلام کا اعلان کرنے کے بعد آپ کو برطانیہ میں مقیم مسلمانوں اور نومسلم تنظیموں کی مذہبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔

بحیثیت ایک ممتاز نومسلم مصنف اور مقرر ہونے کے آپ انگلستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے بین الاقوامی شہرت کے اسلامی مرکز شاہ جہان مسجد، ووکنگ، سرے سے بھی وابستہ رہے۔ جب ۱۹۱۹ء حضرت خواجہ کمال الدین صاحب، بانی ووکنگ مسلم مشن، بیماری کی وجہ سے تقریباً ایک سال کے لئے ہندوستان چلے گئے تو پکتھال صاحب نے نہایت قابلیت سے نہ صرف ان کی نیابت کی بلکہ وہاں سے شائع ہونے والے ماہ نامہ ''اسلامک ریویو'' (Islamic Review) کی ادارت کی اور مسلم پرئر ہاؤس لندن میں نماز پنجگانہ کی امامت اور نماز تراویح پڑھانے کی سعادت بھی حاصل کی اور عیدالفطر کی نماز شاہ جہان مسجد، ووکنگ میں پڑھائی۔ ووکنگ مسلم مشن میں تبلیغ و اشاعت میں خدمات کے سرانجام دینے کے بعد ان میں خدمتِ اسلام کے لئے جذبہ نے جلا پائی اور انہوں نے خدمت اسلام کے لئے زیادہ اہم کردار ادا کرنے کا ارادہ کرلیا۔ پکتھال ایک پیدائشی انگریز تھے اور قرآن کریم کی تفہیم سے متعلق انگریزوں کی دشواریوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس لئے آپ چاہتے تھے کہ اپنے اہلِ وطن انگریزوں کی فکری ضرورتوں کی تشفی کے لئے قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کریں۔ اس مقصد کے لئے انہیں فرصت اور سرپرستی کی ضرورت تھی جو آخرکار انہیں ہندوستان میں اس وقت میسر آئی جب عزت مآب میر عثمان علی خان، نظام حیدرآباد دکن نے ان کی محکمہ تعلیم میں چادر گھاٹ ہائی سکول کے پرنسپل کے طور پر تقرری کر دی۔ ترجمہ قرآنِ کریم کی تکمیل کے لئے آپ کو مشاہرہ کے ساتھ دو سال کی رخصت عطا کی گئی۔ قرآن کریم کے ترجمہ کو مکمل کرنے کے بعد آپ مصر تشریف لے گئے تاکہ جامعہ ازہر کے جید علماء کے مشورہ سے اس پر نظر ثانی کر سکیں۔ اس سلسلہ میں جن مشکل مراحل سے ان کو گزرنا پڑا اس کی تفصیل انہی کی زبانی الگ سے شائع کی جا رہی ہے۔ آپ کا ترجمہ قرآن کریم دسمبر ۱۹۳۰ء میں الفرڈ اے نوف کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ آپ کی اس نہایت مقدس کوشش اور وسیع مطالعہ کے ثمرات کا اندازہ ان تبصروں سے لگایا جا سکتا ہے جو اس ترجمہ کے بارے میں اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔

قرآنِ کریم کے انگریزی ترجمہ کی قابل قدر اسلامی خدمت کے علاوہ آپ نے حیدرآباد دکن سے شائع ہونے والے گراں قدر سہ ماہی رسالہ ''اسلامک کلچر'' کی ادارت کے فرائض جنوری ۱۹۲۷ء سے اپنی وفات مئی ۱۹۳۶ء تک انجام دیئے۔ آپ اس رسالہ کے بانی مدیر بھی تھے۔ اس رسالہ کا شمار ہندوستان سے انگریزی زبان میں شائع ہونے والے کامیاب ترین اسلامی رسائل میں ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور علمی دنیا میں ''اسلامک کلچر'' کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

پکتھال نے اخبارات میں لاتعداد مضامین اور ادارتی شذرے لکھے۔ ان کے علاوہ چودہ ناول، افسانوں کے چار مجموعے، مضامین کے چار مجموعے اور دو مجموعے خطبات کے یادگار چھوڑے ہیں۔ آپ کے تحریری کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ قرآنِ کریم کا انگریزی ترجمہ ہے جس کے اب تک یورپ، امریکہ، ہندوستان، پاکستان اور دیگر کئی ممالک سے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹ر مئی ۱۹۳۶ء کی صبح پکتھال اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ جمعۃ المبارک، ۲۲ر مئی ۱۹۳۶ء کی صبح کو پکتھال کے جسد خاکی کو بروک وڈ قبرستان، سرے (انگلستان) لایا گیا لیکن تدفین کو اگلی صبح تک ملتوی کر دیا گیا تاکہ نمازِ جنازہ اور تدفین میں شمولیت کے خواہشمند افراد بروک وڈ پہنچ سکیں۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ خاندان کے لوگوں کے علاوہ سوگواروں میں مرحوم کے دوستوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی۔ ان میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر ایف کیرن کاو صاحب، شاہ جہان مسجد ووکنگ کے امام مولانا آفتاب الدین احمد صاحب اپنے تمام عملہ سمیت موجود تھے۔ آپ ہی نے پکتھال کی نماز جنازہ پڑھائی۔ تقریباً دن کے ساڑھے گیارہ بجے مغرب میں مشرقی و اسلامی علوم کے مایہ ناز عالم اور امتِ مسلمہ کے اس عظیم مفکر، محمد مارما ڈیوک ولیم پکتھال کے جسد خاکی کو لحد میں اتار دیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند کرے اور عالمِ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے آپ کی کوششوں کو شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین ثم آمین!

***

انگریزی سے ترجمہ حافظ خورشید احمد (ایم اے)

عرب اور غیر عرب دنیا کے نزدیک قرآنِ کریم کے ترجمہ کا مسئلہ

از محمد مارماڈیوک پکتھال

دوسری اور خصوصاً تیسری صدی ہجری میں نسلی عربوں اور غیر عربوں کی اکثریت کے درمیان ایک تناؤ کی کیفیت تھی۔ اس کی وجہ عربوں کا اپنے فاتح ہونے کا زعم تھا اور وہ اپنے کو آقا اور غیر عربوں کو اپنا ماتحت سمجھتے لیکن اس کی ایک اور وجہ غیر عربوں کی دن بدن بڑھتی ہوئی اہمیت بھی تھی۔ حالانکہ عرب جن کو اپنا ماتحت خیال کرتے تھے اب وہ کافی حد تک ہر میدان میں برتری کی حیثیت اختیار کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں خاندانِ برامکہ کی مثال دی جا سکتی ہے۔ ایرانی واحد غیر عرب قوم تھی جو ایک الگ ادبی زبان کی وجہ سے خود کو ممتاز سمجھتی تھی۔ اسی لئے ایرانیوں کو عرب زیادہ شبہہ اور حسد کی نظر سے دیکھتے تھے۔ شامی، عراقی اور مصری لوگوں کی زبانیں چونکہ عربی سے زیادہ ملتی جلتی تھیں اسی لئے وہ بہت جلد عربی زبان میں مدغم ہو گئیں لیکن ایرانی جو غیر عرب تھے، وہ تہذیب، اطوار اور روایات کی برتری کی وجہ سے انتظامیہ کو متاثر کرنے لگے۔ ادھر عربوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ ایرانیوں کی زبان کو عربی سے نچلے درجے پر رکھا جائے۔ عربی زبان کی یہ برتری اس لئے بھی اس کا مقدر بن گیا تھا کیوں کہ قرآنِ کریم کا نزول عربی زبان میں ہوا تھا۔ ادھر ایرانی مسلمان عربی سے ناواقف تھے اور اس کو سمجھنے کے لئے انہیں بہر حال قرآنی الفاظ کے معانی کی وضاحت کی ضرورت تھی۔ ان وجوہات کی بناء پر یہ مسئلہ سامنے آیا کہ:

کیا قرآنِ کریم کا ترجمہ کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

عظیم مسلمان مفکر اور فقیہہ حضرت امام ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں نہایت معقول تھا۔ اسی معقولیت کی بناء پر انہوں نے ان لوگوں کے لئے جو عربی کو نہ جانتے تھے، قرآن کریم کے ترجمہ کو جائز قرار دیا تھا کہ ایسے لوگ نمازوں کی ادائیگی کے دوران تلاوت کئے جانے والے عربی الفاظ کے معانی کو اپنی زبان میں سمجھ سکیں۔ ان کی رائے یہ تھی کہ قرآنِ کریم کی کسی آیت یا سورت بلکہ تمام آیات اور تمام سورتوں کا ترجمہ فارسی زبان میں ہو سکتا تھا اور اس سے یہ جواز بھی نکلا کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ کسی بھی زبان میں ہو سکتا تھا۔ لیکن ان کے نزدیک اس اجازت سے یہ ہرگز مراد نہ تھا کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ بغیر عربی متن کے شائع ہو یا صرف ترجمہ کا ہی مطالعہ کیا جائے۔

لیکن بعد کے علماء نے قرآن کریم کے ترجمہ کو مکمل طور پر ناجائز قرار دے دیا البتہ فارسی میں تفسیر لکھنے کی اجازت تھی تا کہ غیر عربوں کو قرآن سمجھنے سے محروم نہ رکھا جائے، دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک عربی کے علاوہ کسی بھی زبان میں ترجمہ کرنا جائز تھا۔

اگرچہ قرآنِ کریم کی، عربی کے علاوہ کسی زبان میں، تفسیر ایک لازمی ضرورت تھی جس میں ترجمہ بھی شامل ہو لیکن ایسی اجازت سے خدشہ یہ تھا کہ کہیں غیر عرب مسلمان اس جانب راغب نہ ہو جائیں کہ وہ اپنی زبان میں ترجمۂ قرآن کو قرآنِ کریم کا نعم البدل سمجھ لیں۔ اس طرح یہ رجحان تفرقہ کا سبب نہ بن جائے۔ عربی متن کے ساتھ ترجمہ و تفسیر کی پابندی کے فیصلے کا مقصد یہ تھا کہ ترجمۂ قرآن کی ایسی صورت کو روکا جائے کہ کہیں ترجمہ عبادات میں عربی قرآنِ کریم کے متبادل کے طور پر استعمال نہ ہونا شروع ہو جائے۔ بہر حال ایسے ترجمۂ قرآن کی اجازت ضرور تھی جسے صرف وضاحت اور رہنمائی کے لئے استعمال کیا جائے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں کسی بھی غیر عرب مسلمان کے دل میں قرآنِ کریم کا اپنی زبان میں ایسا ترجمہ کرنے کا خیال بھی نہیں گزرا ہو گا جیسا کہ انگریزی بولنے والے پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے ہاں بائبل کے انگریزی ترجمہ کا مقام ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ مجید کا ترجمہ ان کو اصل قرآنِ کریم کے متبادل کے طور پر استعمال کرنا ہرگز پیشِ نظر نہ تھا۔ چنانچہ اس طرح کی ایک تجویز جب ایک زمانہ میں، ترکی میں پیش کی گئی تو اسے یکسر رد کر دیا گیا۔ ان کے علماء کا بھی یہی فیصلہ تھا کہ قرآنِ کریم کی تفسیر کرنا جائز ہے لیکن ترجمہ کرنا ناجائز ہے۔ اس طرح انہوں نے عملاً تفاسیر کے ذریعے حاصل ہونے والی روشنی کو بھی مکمل طور پر اپنے آپ تک محدود رکھا۔ حتیٰ کہ صدیوں بعد کے زمانہ میں وہ اس بات کے بھی مخالف ہو گئے کہ لوگوں کو ان الفاظ کے معانی سکھائے جائیں جو وہ عبادات میں تلاوت کرتے تھے کیوں کہ اس طرح کی لاعلمی، مذہبی تعلیم کے ماہرین کی حیثیت سے ان کی اہمیت کو لوگوں کے مقابلہ میں ممتاز رکھتی تھی۔ لیکن ایک وقت آیا کہ حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ عربی سے لاعلم مسلمانوں کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا اور ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ قرآن مجید کی تعلیمات کی حقیقت سے واقفیت حاصل کریں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کسی بھی مسلمان قوم پر یورپی تسلط قائم نہیں ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہت پہلے اسلام کو بدنام کرنے کے ارادہ سے غیر مسلموں نے اطالوی، فرانسیسی، المانوی اور انگریزی زبانوں میں تراجم کئے جو شائع بھی

ہوئے۔

قرآنِ مجید کے ترجمہ اور تفسیر سے متعلق یہ تاریخی پس منظر میری قرآنِ مجید کے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی کوشش کے سلسلہ میں کافی ہے جس کے متعلق بعد میں ذرا تفصیل سے ذکر کروں گا۔

۱۵رنومبر ۱۹۲۹ء کو میں اور میری بیوی مصر پہنچے تو میرے سامان میں قرآنِ کریم کے ترجمہ کا وہ ٹائپ شدہ مکمل مسودہ بھی موجود تھا جس پر میں وقفے وقفے سے کئی برس سے کام کر رہا تھا اور جس کو مکمل کرنے کے لئے عالی مرتبت میر عثمان علی خان، نظام حیدرآباد دکن نے کمال فیاضی سے ذرائع و وسائل فراہم کئے تھے۔ میرا مقصد یہ تھا کہ مصر کے علماء کو قرآنِ مجید کا یہ ترجمہ دکھاؤں اور ان کی نگرانی میں اس پر نظرِ ثانی کروں تا کہ اس میں غلطیوں کا احتمال نہ رہے اور کوئی بات ایسی نہ ہو جو مسلمہ اسلامی عقائد اور تصورات کے خلاف ہو۔ میرے پاس شیخ مصطفیٰ المراغی کے نام ایک تعارفی خط بھی تھا۔ یہ خط اس وقت لکھا گیا جب وہ شیخ الازہر کے منصب پر فائز تھے لیکن میرے مصر پہنچنے سے کچھ ہی دن قبل انہوں نے اس نہایت عمدہ مشاہرہ والی ملازمت اور منصب جلیلہ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

مصر آنے سے کئی ماہ قبل میں نے اپنے ایک پرانے دوست کو یہ جاننے کے لئے ایک خط لکھا تھا کہ وہ کہاں تک قرآن مجید کے ترجمہ کی نظر ثانی کرنے کے سلسلہ میں مصر میں میری مدد کر سکیں گے۔ میرے یہ پرانے دوست بعد میں وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے لیکن ان کی طرف سے مجھے کوئی جواب نہیں ملا اور میرا سارا انحصار اسی مذکورہ بالا تعارفی خط پر تھا اور اس بات سے مجھے کافی ڈھارس بھی تھی کہ میرے نہایت قریبی دوست فواد بے سلیم الحجازی سکندریہ میں تھے اور انہوں نے چند ماہ پہلے پیرس میں ہونے والی ملاقات کے دوران وعدہ فرمایا تھا کہ وہ حتی المقدور میری مدد فرمائیں گے۔ میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ قبل ازیں ایک مسلمان کے انگریزی ترجمۃ القرآن کو مسجد الازہر کے صحن میں عوام کے سامنے نذرِ آتش کر دیا گیا تھا اور مصر میں اس انگریزی ترجمہ قرآن کی آمد پر پابندی عائد کر دی گئی تھی لیکن اس بارے میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ اس میں مسلمہ عقائد سے کچھ انحراف کیا گیا تھا۔

فواد بے کو جیسے ہی ہماری آمد کا علم ہوا وہ فوراً آئے اور ہمیں ایک ہفتہ کے لئے سمندر کے کنارے رملہ میں ایک پرلطف باغ میں لے گئے جہاں ہماری رہائش کا بندوبست تھا۔ یہاں مجھے اس بات کا علم ہوا کہ علماء کا ایک بااثر گروہ قرآنِ کریم کا ترجمہ کرنے کو، خواہ وہ کتنے ہی خلوص سے کیا گیا ہو، ناجائز خیال کرتا ہے۔ تاہم ہمارے دوست میری آمد سے قبل ہی لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کرتے رہے اور ان کا خیال تھا کہ اسی طرح کا یا اس سے بھی زیادہ بااثر علماء کا ایک طبقہ بالکل مختلف رائے رکھتا ہے۔ انہی میں سے ایک شیخ مصطفیٰ المراغی تھے۔ میرے دوست یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ میرے پاس شیخ المراغی کے نام لارڈ لائیڈ کا لکھا ہوا ایک تعارفی خط موجود ہے۔

ہم سب اکٹھے قاہرہ چلے گئے، جہاں فواد بے نے قصر النیل کے سائے میں ایک پرسکون مہمان خانہ ہمارے لئے ڈھونڈ نکالا۔ ہماری آمد کے دو دن بعد مجھے دریائے نیل کے کنارے ایک لمبی شاہ راہ کے ذریعے شیخ المراغی کی زیارت کے لئے حلوان لے جایا گیا۔ شیر کی کھال کے رنگ کی ریگستانی چٹانوں کے دامن میں ایک جدید صاف ستھرا شہر جو سفیدی کا مرقع تھا، اس میں ہر طرف ہوٹل اور وسیع و عریض گھر ہی گھر نظر آ رہے تھے۔ اس باضمیر مسلمان عالم شیخ المراغی نے شیخ الازہر کے منصبِ جلیلہ کو خیرباد کہہ کر اس شہر کے ایک گھر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔

شیخ ستواں اور بلند قامت تھے۔ ماہ و سال کے حوالہ سے ابھی وہ عمر کی بہترین بہاریں دیکھ رہے تھے۔ آپ نے سر پر صاف ستھری پگڑی باندھ رکھی تھی اور مصری علماء والا نفیس کپڑے سے بنا لمبا جبہ زیبِ تن کر رکھا تھا۔ انہوں نے اپنی گردن پر گلوبند لپیٹ رکھا تھا جو کہ ایک جانب سے نسبتاً اٹھا ہوا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ایسا ایک نشان کو چھپانے کے لئے کیا گیا تھا جو جلنے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب وہ قاہرہ کی مسلم عدالت میں قاضی کے فرائض انجام دے رہے تھے تو انہوں نے جائیداد کے ایک مقدمہ میں کچھ یتیم بچوں کو ایک دولت مند عرب سے ان کا حق دلانے کا فیصلہ دیا تو دولت مند عرب نے انتقاماً گندھک کا تیزاب آپ پر پھینکوا دیا۔ خوش قسمتی سے تیزاب ان کے چہرے پر نہیں پڑا لیکن آپ کی گردن اور سینے کی ایک جانب بری طرح جھلس گئے۔ فواد بے نے بعد ازاں بتلایا کہ ”میں عام طور پر علماء کے ہاتھ نہیں چوما کرتا لیکن میں اس شخص یعنی شیخ المراغی کی دست بوسی ضرور کرتا ہوں“۔

شیخ نے بڑے کریمانہ انداز میں ہمارا استقبال کیا۔ چائے سے ہماری تواضع کی اور ہمیں لے کر باہر برآمدہ میں آ گئے۔ جہاں سے صحرائی پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ میرے ساتھ آنے والے، فواد بے اور قاہرہ کے ڈپٹی گورنر اسماعیل بے شیرین نے میرے مستقبل کے پروگرام سے متعلق میزبان سے تبادلہ خیالات کیا۔ شیخ نے ہمیں بتایا کہ جب وہ شیخ الازہر تھے تو اس وقت کے وزیرِ اعظم نے ان سے میرے ترجمہ قرآن کے بارے میں بات کی تھی۔ وزیرِ اعظم کا ارادہ تھا کہ وہ جامعۃ الازہر کے علماء کی ایک کمیٹی کا تقرر کریں گے جو میرے ساتھ اس ترجمہ پر نظرِ ثانی کرے گی۔ لیکن ان کے اس اقدام کو بادشاہ نے روک دیا جو کسی طرح اُس رائے سے متاثر ہو چکے تھے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ کرنا گناہ ہے۔ چوں کہ الازہر کی تمام تر سرپرستی شاہِ مصر کرتے تھے اس لئے سرکاری طور پر الازہر سے درخواست کرنا بے سود تھا۔ شیخ اپنی زیرِ نگرانی

میرے قرآن مجید کے ترجمہ پر نظر ثانی کے لئے تیار تھے اور ان کا خیال تھا کہ ہمیں بآسانی تین یا چار الازہر کے علماء مل جائیں گے جو ایک غیر مذہبی جامعہ میں تعلیم و تدریس کا کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے فواد بے کو چند نام بتلائے۔ انہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ وہ انگریزی سے بالکل واقف نہیں ہیں۔ اس لئے وہ قرآن مجید کے ترجمہ کا بذاتِ خود جائزہ لینے سے قاصر ہیں۔ البتہ انہوں نے اس بات کی حامی بھری کہ اگر کچھ الفاظ یا اقتباسات کو سمجھنے میں مجھے دشواری ہوئی تو میں انہیں لکھ کر شیخ کی خدمت میں پیش کروں اور اپنی دشواری کی نوعیت بتاؤں تو وہ اپنی وضاحت یا رائے لکھ کر میرے سامنے رکھ دیں گے۔ ان خیالات کو لئے ہوئے ہم گاڑیوں میں بیٹھ کر قاہرہ واپس آ گئے کہ اب ترجمہ کے سلسلہ میں تمام معاملات طے ہو گئے ہیں۔ لیکن جب ہم غیر مذہبی جامعہ کے سربراہ، لطفی بے السید، کے گھر پر شیخ المراغی کے تجویز کردہ تین علماء سے ملے تو یکدم سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ اس لئے کہ جب جامعہ کے سربراہ لطفی بے نے عربی کالج کے نابینا سربراہ پروفیسر طٰہٰ حسین کو دعوت دی کہ وہ ترجمہ کے سلسلہ میں ہماری مشاورت کے لئے موجود رہیں تو طٰہٰ حسین صاحب نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ چونکہ شاہِ معظم، قرآن مجید کے ترجمہ کے خلاف ہیں اس لئے وہ تینوں ازہری علماء جو میری مدد کریں گے، انہیں اپنے مناصب سے معزولی کا خدشہ ہو سکتا ہے۔ سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔
اس سے مجھے بے حد مایوسی ہوئی اور جب طٰہٰ حسین نے تجویز پیش کی کہ میں ذاتی طور پر بادشاہ سے ملوں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس ملاقات سے ہو سکتا ہے کہ میں شاہ کو ان کا نقطہ نظر تبدیل کرنے پر آمادہ کر سکوں گا۔ میں نے کہا کہ نہ تو میں اپنے ترجمے کے بارے میں شاہی اجازت نامہ حاصل کرنے کے لئے مصر آیا ہوں اور نہ ہی میں علماء مصر سے فتویٰ لینے آیا ہوں، میں تو پہلے ہی عزت مآب نظام حیدرآباد دکن سے اس ترجمہ کی منظوری حاصل کر چکا ہوں اور ہمارے پاس ہندوستان میں بہت جید علماء موجود ہیں جن سے اس کی نظر ثانی کا مشورہ بآسانی ہو سکتا تھا۔ میں تو عرب دنیا کے علماء اور فضلاء سے قرآنِ مجید میں مستعمل عربی زبان کے بعض الفاظ کے متعلق اپنے شکوک و شبہات کو دور کرنا چاہتا ہوں۔ مشکلات کے پیش نظر میں نے سوچا کہ مصر چھوڑ کر دمشق چلا جاؤں لیکن فواد بے صاحب نے مجھے یقین دلایا کہ وہ اس مشکل کا کوئی حل نکال لیں گے اور پھر واقعتاً جلد ہی انہوں نے میرا تعارف لندن یونیورسٹی کے ایک گریجویٹ اور قرآن کے مطالعہ کے ایک سنجیدہ طالب علم محمد بے احمد الغمراوی سے کرایا جو قاہرہ کے میڈیسن کالج میں کیمسٹری کے لیکچرر بھی تھے، ان کے ساتھ مل کر میں نے قرآنِ کریم کے ترجمہ پر نظر ثانی کا کام تقریباً تین ماہ میں نہایت خوشگوار انداز میں مکمل کیا۔ اس دوران کبھی کبھار فواد بے صاحب تشریف لے آتے اور بعض اوقات شیخ المراغی کی رائے لینے کے لئے ہمیں حلوان رابطہ کرنا پڑتا۔

تین ماہ ہم نے نہایت خاموشی سے کام کیا۔ صرف ایک مرتبہ ماہِ دسمبر میں رات کے کھانے کی ایک دعوت پر باہر جانا ہوا اس موقع پر میری خوش نصیبی سمجھئے کہ میری نشست مصر کے نہایت مستعد اور باہمت مسلمان صحافیوں کے ساتھ تھی۔ اگلے دن میری ذات اور میرے کام کے بارے اخبار ''الاہرام'' میں ایک تبصرہ شائع ہوا جس کی سرخی تھی، ''قرآنِ کریم کا ایک ترجمہ''۔ دو روز بعد الازہر یونیورسٹی کے ایک ریٹائرڈ پروفیسر شیخ محمد شاکر کے قلم سے اسی اخبار میں اسی سرخی کے تحت، قرآنِ مجید کا ترجمہ اور اس کے مترجم کی مخالفت میں دو کالمی مضمون شائع ہوا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ وہی شیخ محمد شاکر تھے جنہوں نے محمد علی (لاہوری) کے ترجمہ قرآن کے خلاف شور و غوغا کرنے والوں کی قیادت کی تھی۔ مترجم اور وہ سب لوگ جنہوں نے اس ترجمہ کو پڑھا یا اس میں کسی طرح کی مدد کی یا اس کو موافقت کی نظر سے دیکھا۔ فاضل مضمون نگار کی نظر میں وہ سب ہمیشہ کے لئے قابلِ مذمت ٹھہرے۔ اور اسی بناء پر مجھے بڑی سنجیدگی سے یہ مشورہ دیا گیا کہ میں اپنے اس غلط کام کو چھوڑ دوں اور اس کی بجائے، جتنے بھی متبادل تراجم کے کام ہو سکتے تھے ان میں سے تفسیر طبری کو تجویز کیا گیا کہ میں اس کا ترجمہ شروع کروں۔ اب تفسیر طبری جس کا ملخص تفسیر بیضاوی ہے، کافی ضخیم کتاب ہے، اس کے اسلوب اور رجحان کو ان انگریزوں کے لئے جنہوں نے کبھی کسی قرآنی تفسیر کا مطالعہ نہ کیا ہو، قابلِ فہم بنانے کی خاطر ترجمہ کے علاوہ اسی ضخامت کی ایک اور تفسیر کی ضرورت تھی، جو اس ترجمہ کے مشکل مفہوم کی وضاحت کر سکے۔

اس انتہائی شدید تنقید کو پڑھ کر میں نے فوراً بیٹھ کر عربی زبان میں ایک جواب تحریر کیا اور اسے لے کر ایک مصری دوست کے پاس گیا جس نے اس میں روایتی صحافیانہ ستائشی کلمات شامل کئے جن سے میں ناواقف تھا۔ پھر میں نے اس خط کی ایک عمدہ سی نقل تیار کی اور اسے لے کر ''الاہرام'' کے دفتر چلا گیا۔ اس خط میں، آداب کے بعد، میں نے ادب سے سوال کیا ''ایک انگریز جو مسلمان ہے، جس نے قدیم علماء کی تفاسیر کا مطالعہ کیا ہے اور جو اپنے ہم وطنوں میں ایک عالم اور مصنف کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے، کیا اس کے لئے شرعاً جائز نہیں ہے کہ وہ موجودہ دور میں اپنے لوگوں کے لئے ان کی اپنی زبان میں قابلِ فہم انداز میں قرآنِ مجید کی تفسیر کرنے کی کوشش کرے؟

میرے خط کے شائع ہونے سے قبل ہی اس موضوع پر اور خطوط بھی شائع ہوئے، جو سب میری تائید میں تھے۔ الازہر کے ایک شیخ نے لکھا کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن اور قابلِ تعریف ہے اور انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اپنے مؤقف کی درستی ثابت کرنے کے لئے شیخ محمد شاکر کو عوامی مناظرہ کی دعوت دیتے ہیں۔ شیخ شاکر نے دعویٰ کیا کہ اس مسئلہ

پر پہلے سے ہی اجماع ہے۔ مراسلہ نگاروں نے شیخ شاکر کے اس دعویٰ کو قطعاً باطل قرار دیا۔ یہ بات اب بالکل واضح تھی کہ قرآنِ مجید کے ترجمہ کے بارے میں الازہر کے اندر بھی دو رائیں پائی جاتی تھیں۔ میں نے اس بارے میں کچھ نجی گفتگوئیں بھی کیں جن سے مجھے پتہ چلا کہ میری طرح دیگر بہت سارے مصری مسلمان ان قدامت پسند علماء کے موجودہ رویہ پر حیران تھے جو عالمی حالات سے اس قدر لاعلم تھے حالانکہ ان کو دعویٰ تھا کہ وہ مسلم دنیا کے فکری رہنما ہیں اور اس حقیقت کے باوجود وہ ابھی تک اس خیال میں مبتلا تھے کہ ''عرب ابھی بھی آقا ہیں'' اور غیر عرب ان کے ماتحت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بھی قطعاً بے خبر ہیں کہ حالات بدل چکے ہیں۔ اب عرب جنگ جو نہیں رہے اور نہ ہی غیر عرب اب گھروں کی چاردیواری میں مقید ہیں بلکہ غیر عرب اب جہاد کا صحیح معنوں میں حق ادا کر رہے ہیں اور یہ کہ غیر عربوں کے مسائل عربوں کے مسائل سے مختلف ہیں اور یہ کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ اب غیر عربوں کی لازمی ضرورت بن چکا ہے جس کی عربوں کو تو قطعاً ضرورت نہیں۔ وہ لوگ یہ باور ہی نہیں کر سکتے کہ ہندوستان میں بھی ایسے مسلمان ہیں جو اتنے ہی عالم فاضل، دین دار اور اتنی علمی سوجھ بوجھ اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اسلام کے تحفظ کا فرض اتنی ہی مستعدی سے ادا کر سکیں جیسے کہ مصر کا کوئی عالم کر سکتا ہے۔

میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ کس طرح قبل ازیں ایک مسلمان کے ترجمہ قرآن کو عوام کے سامنے نذرِ آتش کر دیا گیا تھا اور اس کے مزید نسخوں کے مصر میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ قاہرہ کی ایک پرہجوم گلی میں چلتے ہوئے میں نے کتابوں کی ایک یورپی دکان کی الماری میں غیر مسلموں کے کئے ہوئے قرآن مجید کے دو تراجم کو بہت نمایاں جگہ پر نمائش کے لئے رکھا ہوا دیکھا۔ ان میں سے ایک ترجمہ کے سرورق پر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی تصاویر چھپی ہوئی تھیں۔ اس وقت میں نے اپنے آپ سے سوال کیا: اس میں کیا سمجھداری ہو سکتی ہے کہ دیانت داری سے کئے گئے ایک قابل احترام ترجمہ کو تو جلا دیا جائے اور اس پر پابندی لگا دی جائے جبکہ عزت و توقیر سے عاری یہ تراجم، مغرب کی ذہنی غلامی کے زیر اثر، آزادی سے یہاں فروخت ہو رہے ہیں۔

آخر کار شیخ محمد شاکر کی طرف سے میرے خط کا جواب ''الاہرام'' میں شائع ہوا۔ اس مرتبہ ترجمہ کرنے کی مذمت میں کوئی الفاظ کی یلغار نہ تھی بلکہ اس بات کا بے تکلف اور فراخ دلانہ اعتراف تھا کہ جس نوعیت کے کام کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، وہ نہ صرف جائز اور درست ہے بلکہ مستحسن اور قابل ستائش ہے۔ وہ میرے خط میں لکھی ایک بات پر کچھ تذبذب کا شکار تھے کہ ''قرآنِ کریم کی اس انداز میں وضاحت کی جائے کہ میرے ہم وطن اس کو سمجھ سکیں''۔ انہیں اس بات کا خدشہ ہوا کہ اس سے مراد قرآنِ مجید کی شاید کوئی ایسی تبدیل شدہ تشریح و توضیح ہو گی جو جدید نظریات سے زیادہ مطابقت رکھتی ہو۔ ''اس لمحے میرے ذہن میں ان کی وہ تجویز گردش کرنے لگی کہ مجھے قرآن مجید کا ترجمہ چھوڑ کر تفسیر طبری کا ترجمہ کرنا چاہئے۔ جس کی تفسیر اس انداز میں ابھی تک بیان نہیں کی گئی کہ میرے ہم وطن اس کو سمجھ سکیں۔''

فواد بے اخبارات میں شائع شدہ ساری خط و کتابت کو پڑھ کر اڈلین فرصت میں سکندریہ سے تشریف لے آئے۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ شیخ شاکر کی سخت تنقید پڑھ کر پریشان ہو گئے تھے لیکن جب انہوں نے میرا جواب پڑھا تو ان کا اعتماد کافی حد تک بحال ہو گیا۔ انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ اس مسئلہ کو اسی لئے اٹھایا گیا تھا تا کہ اس پر بحث مباحثہ ہو اور ان کے نزدیک اس بات کا قوی امکان تھا کہ مسئلہ اب ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا۔ ان کے نزدیک قرآنِ مجید کے ترجمہ کے متعلق مصر کا رویہ اس کی رسوائی اور بدنامی کا باعث بن رہا تھا۔

انہوں نے ایک بااثر مزاحیہ اخبار کا ایک شمارہ مجھے دیا جس کے ایک مضمون میں ہلکے پھلکے انداز میں شیخ شاکر صاحب کے خیالات کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ بلاشبہ عمومی طور پر اس بارے میں رائے شیخ شاکر صاحب کے خلاف تھی۔

عین اسی وقت میرے دوست اور معاون، عمر اودی بے میرے لئے تنظیم شبان المسلمین کی طرف سے چائے پارٹی کا دعوت نامہ لے کر آئے اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کہ مجھے چائے کے بعد تقریر بھی کرنا ہو گی۔ ان کا معمول تھا کہ وہ میڈیسن کالج میں تدریس کے بعد ہیلیو پولس میں اپنے فلیٹ سے ٹینس کھیلنے کے لئے شبان المسلمین کے ہیڈ کوارٹر جاتے اور اس کے نزدیک قصر عین کے ٹینس کورٹ میں کھیلتے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ وہاں ان نوجوانوں سے اکثر علمی گفتگو کرتے ہیں جن کے ذہن میں جدید علوم کی وجہ سے مذہب کے بارے میں سوالات اٹھتے یا شکوک پیدا ہوتے۔ سائنس کے ایک استاد ہونے کے ناطے سے وہ ان کو بتاتے کہ ان سوالات کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ کیا ہے اور اس طرح انہوں نے بہت سے نوجوانوں کو دینی مسائل اور دیگر معاملات میں رہنمائی کی اور ان کے بہت سے شبہات کو زائل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ میں اتنے اچھے اور مخلص اور حد درجہ تعاون کرنے والے دوست کی پہلی ہی دعوت کو ٹھکرانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک تقریب میں شرکت اور پھر اس میں تقریر کرنے کا مطلب، نظر ثانی کے مسلسل کام میں رکاوٹ پیدا کرنا تھا لیکن میں نے تقریر کرنے کی حامی اس شرط پر بھری کہ مجھے فی البدیہہ تقریر کی اجازت ہو گی اور میں طلباء کے سامنے انگریزی میں تقریر کروں گا کیوں کہ عربی میں تقریر تیار کرنے کے لئے کافی محنت درکار تھی، جس سے نظر ثانی کے کام کا حرج ہو گا۔ میرے دوست نے آخر کار اس بات کو

منظور کر لیا اور بذاتِ خود یہ ذمہ داری اٹھا لی کہ وہ میرے خیالات کا ساتھ ساتھ عربی میں ترجمہ کر دیں گے تاکہ انگریزی سے ناواقف حاضرین بھی مستفید ہو سکیں۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق، غروبِ آفتاب سے پہلے شام کو وہ مجھے لینے کے لئے آ پہنچے۔ ہم دونوں چلتے ہوئے عین مغرب کے وقت متعلقہ جگہ پر پہنچ گئے۔ وہاں ممتاز ہستیوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جنہوں نے نہایت گرم جوشی سے مجھے خوش آمدید کہا۔ پھر ہم چائے کے لئے چلے گئے۔ جب مجھے تقریب میں شامل شخصیات کے بارے تفصیلات معلوم ہوئیں تو میں نے محسوس کیا کہ جو تقریر میں یہاں کرنا چاہتا ہوں، وہ اب موزوں نہ ہو گی۔ پگڑیوں اور لمبے، نفیس جبوں میں ملبوس لوگوں کی بڑی تعداد سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہاں تو سارا الازہر امڈ آیا ہے۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ یہاں صرف جدید علوم کے زیرِ تعلیم طلباء ہی ہوں گے۔ اسی ذہنی کشمکش کے دوران میں نے سوچا کہ اگر مجھے لوگوں پر کوئی اچھا تاثر چھوڑنا ہے تو مجھے عربی زبان میں بھی کچھ اظہارِ خیال کرنا ہو گا، اور اپنی انگریزی تقریر کے نفسِ مضمون کو بھی تبدیل کرنا ہو گا۔ انگریزی تقریر تو بعد میں ہو گی۔ فی الوقت مجھے اپنی سوچ کو عملاً ان خیالات پر مرکوز کرنا پڑا جن کا اظہار ابتدائیہ کے طور پر میں عربی زبان میں کرنا چاہتا تھا، باقی سب کچھ میں نے اللہ پر چھوڑ دیا۔ چائے ختم ہوتے ہی ہم پرہجوم لیکچر ہال میں چلے گئے۔ مجھے بولنے کے لئے بلایا گیا۔ غمراوی بے صاحب میرے ایک جانب کھڑے ہو گئے۔ شیخ رشید رضا دائیں جانب میرے قریب ہی تشریف فرما تھے۔ ہال کے وسطی حصے میں محمد علی بے کامل کو بیٹھے ہوئے دیکھا ان کے ساتھ ہی فواد بے کا صاحب زادہ بیٹھا ہوا مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے (میرے بارے) کچھ خوف محسوس کر رہا ہو۔ اس سارے ہجوم میں یہی چند شناسا چہرے تھے۔

کسی نے کچھ تعارفی کلمات کہے، میرا خیال ہے یہ غمراوی صاحب تھے۔ پھر میری باری آئی۔ اپنے آپ کو بہت حقیر محسوس کرتے ہوئے میں نے کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' حاضرین کے بھرپور اور خوشگوار سلام کے جواب نے میری کچھ ہمت بڑھائی۔

میں نے تقریباً پانچ منٹ تک عربی میں تقریر کی جس میں محض اس بات کی معذرت کرتا رہا کہ اس گفتگو کے بعد میری تقریر انگریزی میں ہو گی۔ میں نے اس بات کی وضاحت بھی کی کہ میں نے انگریزی میں تقریر کرنے کی رخصت کیوں چاہی۔ پھر انہیں اس سلسلہ میں ایک حکایت سنائی۔ یہ سب کچھ میں نے پگڑیاں پہنے ہوئے طبقہ کے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے کیا۔ پھر انگریزی تقریر شروع کی۔ غمراوی بے ہر بیان کا ترجمہ کرتے رہے۔ میں نے طلباء کو حیدر آباد (دکن) کے بارے میں بتایا کہ تعلیمی میدان میں وہاں کیا کام ہو رہا ہے۔ میں نے اسی طرح کی باتوں سے انگریزی میں تقریر کا آغاز کیا۔ میں نے حیدر آباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بارے میں بھی انہیں بتایا۔ میں نے وہاں کی مکہ مسجد میں نمازِ جمعہ کے اجتماع کا ذکر کیا اور انہیں بتایا کہ کس طرح عالی مرتبت نظام ہر جمعہ کے دن مسجد تشریف لے جاتے ہیں۔ (اس پر داد و تحسین کے نعرے بلند ہوئے اور ایک عمر رسیدہ آدمی پکار اٹھا ''اے کاش مصر میں بھی ایسا ہوتا'') پھر یہ سوچتے ہوئے کہ میں نے ان پر یہ واضح کرنے کے لئے کافی کچھ کہہ دیا ہے کہ میں کسی اندھیر نگری سے نہیں آیا ہوں۔ میں نے اسلام کے مستقبل کے بارے ان سے بات کی۔ اس بات کا بھی ذکر کیا کہ مسلمان شکست خوردہ ہونے کی وجہ سے مایوسی کا شکار ہیں، جو ایک قدرتی بات ہے لیکن مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا ہماری موجودہ حالت اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ان کے صحابہ کی حدیبیہ والی صورتِ حال میں واضح مماثلت نہیں پائی جاتی، جب مسلمانوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سوال کیا تھا کہ ''کہاں ہے وہ فتح جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا تھا؟'' اور حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے اس موقعہ پر ایسی ہی ایک بات کا اظہار کر دیا جس پر بعد ازاں وہ ہمیشہ پچھتاتے رہے۔ پھر بھی صلح حدیبیہ، بظاہر اگرچہ اس دور کے مسلمانوں کے لئے ذلت آمیز صلح معلوم ہوتی تھی لیکن درحقیقت اس وقت تک حاصل ہونے والی فتوحات میں سے عظیم ترین فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ صدیوں سے مسلمانوں اور عیسائی دنیا کے درمیان جنگ نے بہت بڑی رکاوٹ کھڑی کر دی تھی لیکن صلح حدیبیہ نے یہ رکاوٹ دور کر دی۔ دونوں گروہوں کے لوگ گھل مل گئے اور آپس میں تبادلہ خیالات ہوا جس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی دو پرامن سالوں میں قبولِ اسلام کرنے والوں کی تعداد پہلے سے موجود مسلمانوں کی مجموعی تعداد سے بھی بڑھ گئی تھی۔ اس کے بعد پھر صدیوں تک عالمِ اسلام اور عیسائی دنیا کے درمیان جنگ کی دیوار حائل رہی۔ اب جب کہ یہ سدِ راہ ختم ہو چکی ہے، اگرچہ اس وقت بھی معاہدہ کی شرائط مسلمانوں کے لئے ذلت آمیز محسوس ہوتی ہیں۔ عین ممکن ہے یہ بظاہر ذلت آمیز معاہدہ بھی عظیم فتح پر منتج ہو جس کے لئے ایک مشکل شرط یہ ہے کہ مسلمان ایک مرتبہ پھر اوّلین مسلمانوں کی طرح ایمان اور اخلاقی بلندی کا نمونہ پیش کریں۔ پھر میں نے ان سے سوال کیا: کیا آپ کے خیال کے مطابق اسلام کی اشاعت تلوار کے ذریعے ہوئی تھی؟ جب غمراوی بے نے میرے اس سوال کا ترجمہ کیا تو جواب میں غم آلود آواز میں، نہیں! اور معاذ اللہ کہا گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ اہلِ عجم عربوں کا کتنا احترام کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہند میں ہم ان کا کتنا احترام کرتے ہیں۔ ہم انہیں کس حد تک مثالی گردانتے ہیں اور میں نے گذارش کی کہ ان کو بھی ویسی ہی مثال قائم کرنا چاہئے۔ میری تقریر ختم ہوئی تو شیخ رشید رضا نے اپنی تقریر میں میری کہی ہوئی تمام باتوں کی تائید

کی اور کہا کہ جب وہ ہندوستان تشریف لے گئے تھے تو لوگ ان کے احترام میں انبوہ در انبوہ صرف اسی لئے اکٹھا ہوئے تھے کہ وہ ایک عرب تھے اور اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام کی سرزمین سے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے مرحوم شیخ محمد عبدہ کے الفاظ کا حوالہ دیا: ''ہم (عرب) مغرب میں اشاعتِ اسلام کے راستے میں اپنے رویے کی وجہ سے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے مذہب کو ہماری شخصیت کے آئینے میں دیکھتے ہیں تو انہیں ایک ناپسندیدہ تصویر نظر آتی ہے تو نتیجتاً اسلام کے متعلق وہ غیر منصفانہ رائے قائم رکھے ہوئے ہیں۔ پھر ایک شیخ جواز ہری جبے میں ملبوس تھے۔ سٹیج پر تشریف لائے اور جو کچھ میں نے کہا تھا اس کے لئے دل کی گہرائیوں سے میرا شکریہ ادا کیا۔ اس ساری تقریب کا میرے ترجمہ قرآن سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن اس جلسہ کے بعد عوامی سطح پر میرے ترجمہِ قرآن کریم کے بارے میں کسی نے خواہ مخواہ اعتراض نہ کیا۔ ہم ماہِ رمضان المبارک کے لئے ہیلیو پولس میں واقع عمر اودی بے کے گھر اس لئے چلے گئے تا کہ میں عمر اودی بے کے قریب رہ سکوں۔ اس طرح ترجمہ قرآنِ کریم پر نظر ثانی کا کام رمضان کے مقدس مہینے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

فواد بے عید کے لئے قاہرہ تشریف لے آئے۔ ہماری روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ فواد بے، عمر اودی بے اور میں شیخ المراغی کی زیارت کے لئے حلوان گئے۔ اسی سفر کے دوران عمر اودی نے میرے کام سے متعلق اپنی رائے سنائی۔ اسی رائے کی بناء پر عظیم المرتبت شیخ نے بڑے گرم جوش الفاظ میں میری تعریف لکھی جسے میں انتہائی قابل قدر سمجھتا ہوں کہ یہ الفاظ ہر پہلو سے ایک ایسے راسخ العقیدہ مسلمان نے لکھے تھے جو وہی کچھ لکھتا تھا جسے وہ سچ سمجھتا تھا۔

قبل ازیں ایک ملاقات کے دوران انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں کی تحریروں میں سے ایسے تمام اقتباسات میرے سامنے پڑھے جن سے ثابت ہوا کہ وہ (شیخ) ایک حنفی استاد ہیں اور قرآنِ کریم کے ترجمہ کو شرعاً جائز سمجھتے ہیں۔ وہ اس بات کے متمنی تھے کہ میں اس معاملہ میں انہیں سند سمجھوں اور یہ کہ مخالفین کی طرح میرے ذہن میں یہ ہرگز خیال نہیں گزرنا چاہئے کہ وہ منکرین حدیث کی طرح، احادیث کی روایات کے کٹر مخالف ہیں۔ اس آخری ملاقات کے موقع پر میں نے یہ بتانا اپنا اخلاقی فرض سمجھا کہ میرا ترجمہِ قرآن ایک لحاظ سے امام ابوحنیفہؒ کی عائد کردہ شرائط پر پورا نہیں اترے گا۔ یہ ترجمہ متن کے بغیر شائع ہوگا۔ انہوں نے سوال کیا کہ ایسا کیوں؟ تو میں نے وضاحت کی کہ بہت سی وجوہات ہیں جن کی بناء پر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے:

۱۔ پہلی وجہ یہ کہ اگر متن کے ساتھ ترجمہ شائع کیا جائے تو اخراجات بہت زیادہ ہو جائیں گے۔

۲۔ دوسری یہ کہ متن کے ساتھ ترجمہ غیر مسلم قارئین کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے گا کہ جب وہ سرسری نظر سے اسے دیکھیں گے کہ آدھی کتاب میں عربی متن بھرا پڑا ہے تو وہ اس کو چھوڑ دیں گے۔ اس طرح ایسے ترجمہ میں دلچسپی نہ لیں گے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ کہ اسلام کے خلاف تعصب کے اظہار اور اس پر ناروا حملوں کی روک تھام کے لئے متن کے بغیر ترجمہِ قرآن کی غیر مسلم حلقوں میں وسیع پیمانے پر تشہیر ہو سکے گی۔ حالاں کہ اگر قرآنِ کریم کا ترجمہ کرنا، جیسا کہ ہمارے مخالفین کا دعویٰ ہے، غیر شرعی تھا تو اس آیہ کریمہ کی روشنی میں اسے جائز قرار دے دینا چاہئے تھا۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۔

''حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے بدلے ہے اور تمام حرمت والی چیزوں میں بدلہ ہے۔ پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم اس کو اسی کے مطابق سزا دو جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور اللہ کے تقویٰ پر رہو اور جان لو کہ اللہ ان کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔''

"The forbidden month for the forbidden month, and forbidden things (are lawful) in retaliation. And one who attsacketh you, attack him in like manner as he attacked you. Observe your duty to Allah, and know that Allah is with those who keep their duty." (2:194)

اگر اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزیں جیسا کہ حرام مہینوں میں جنگ و جدل جوابی کارروائی کے طور پر جائز ہے تو پھر ظاہر ہے کہ علماء کی منع کردہ باتوں کے لئے بھی یہی اصول ہوگا۔ یہ بات میں یقیناً کچھ جوش میں کہہ گیا تھا کیوں کہ جب میں سانس لینے کے لئے رکا تو شیخ نے فرمایا: ''اگر آپ کو اپنی بات کے حق ہونے کا ایسا ہی کامل یقین ہے تو پھر اللہ کا نام لے کر اس راستے پر چلتے چلے جائیں جو آپ کے نزدیک واضح ہے اور ہم میں سے کوئی کچھ بھی کہے اس پر کوئی توجہ نہ دیں۔'' جب وہ یہ الفاظ ادا کر رہے تھے تو مجھے دیکھ کر مسکرائے اس لئے کہ یہ وہ لمحہ آ گیا تھا جب ہم دونوں قرونِ وسطیٰ کے اس فکری ماحول سے نکل آئے جس کی فکر ہم دونوں پر اس وقت تک طاری تھی۔

مشہور شاعر دانتے کی نظم ''انفرنو'' یعنی جہنم میں، کا یہ شعر اس موقع پر یاد آ رہا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''صبر آزما جدوجہد کے بعد آخرکار امید کی کرن نظر آئی''۔

جس دن میں اور میری رفیقہِ حیات قاہرہ سے روانہ ہونے والے تھے اس سے ایک دن قبل ایک بدوی سردار جو نئی پارلیمان کے رکن تھے، انہوں نے فواد بے کی تحریک پر مجھے کھانے کی دعوت پر بلایا۔ اس دعوت میں موجودہ

شیخ الازہر بھی تشریف لائے جو کہ ان علماء کے سرکاری قائد تھے جو ترجمہ قرآن کو غیر شرعی قرار دیتے تھے۔ وہ ایک خوبرو اور بظاہر نرم خو بزرگ تھے۔ انہوں نے فاختائی رنگ کا خوب صورت جبہ زیبِ تن کر رکھا تھا اور سر پر سفید براق پگڑی باندھ رکھی تھی۔ کھانے کی میز پر مجھے ان کی دائیں جانب بٹھایا گیا۔ ایک سابق وزیر حلمی پاشا عیسیٰ کے علاوہ، دعوت میں شریک سبھی افراد علماء کی رائے کے مطابق اسلام کے لئے اپنی جاں نثاری ثابت کر چکے تھے۔ فواد بے سمیت وہ سب مجاہدین تھے۔ فواد بے 'برن' میں حکومتِ ترکی کی وزارت سنبھالنے سے پہلے نہر سویز کی مہم میں مصطفیٰ کمال کے ہم رکاب تھے۔ ایک انگریز کو اس طرح کے اجتماع میں دیکھ کر شیخ کا حیران ہونا کچھ عجب نہ تھا اور جب انہوں نے شیخ کو بتایا کہ میں نے ہی قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے، تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے شیخ کو ناگہانی صدمہ پہنچا ہو۔ کھانے کے بعد جب فواد بے نے میرے ترجمہِ قرآن کی تعریف کی اور باقی سب لوگوں نے اسے مستحسن اور قابلِ ستائش قرار دیا تو ظاہر ہے یہ ان کے لئے پریشان کن بات تھی۔ حتیٰ کہ فواد بے نے وضاحت کی کہ: مترجم اسے 'القرآن' نہیں کہیں گے بلکہ وہ اسے 'معانی القرآن المجید' یعنی قرآن مجید کے معانی کا نام دیں گے۔ تب شیخ الازہر مسکرا دیئے اور یوں گویا ہوئے ''اگر مترجم نے ایسا ہی کیا ہے تب اعتراض کی کوئی بات نہیں، ہم سب اس بات سے خوش ہیں''۔ میرے ذہن میں اس وقت قرونِ وسطیٰ کے فکری ماحول کے خیالات گردش کرنے لگے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایک قابل قبول حل تک پہنچ چکے تھے اور میں اس پر خوش اور مطمئن تھا۔

یہ مارچ ۱۹۳۰ء کی بات تھی۔ میرا ترجمہ اسی سال دسمبر میں شائع ہوا۔ اپریل ۱۹۳۱ء میں مجھے عمراوی بے کا خط ملا جس میں انہوں نے مجھے مطلع کیا تھا کہ شیخ الازہر نے انہیں بلا بھیجا تھا اور میرے ترجمے سے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے بہر حال ان کا رجحان میرے ترجمہِ قرآن کے رد کرنے کی جانب تھا۔ تازہ ترین افواہ یہ تھی کہ الازہر نے فیصلہ کیا کہ میرے ترجمہِ قرآن کو لفظ بلفظ دوبارہ عربی میں ترجمہ کر کے اسی بھونڈی شکل میں ان کے ملاحظہ کے لئے پیش کیا جائے، کیوں کہ الازہر کے شیوخ میں سے کوئی بھی انگریزی زبان نہ سمجھتا تھا۔ یہ طریقہ کار یقیناً ایک عظیم پیش قدمی تھی، اس طریق کار کے مقابلہ میں جو مولوی محمد علی (لاہوری) کے انگریزی ترجمہ قرآن کے ساتھ اختیار کیا گیا تھا کہ بغیر تحقیق و تدقیق کے اسے رد کر دیا گیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الازہر کے اندر بھی روشن خیال علماء کا ایک گروہ موجود تھا جو اتنا مؤثر تو ضرور تھا کہ وہ الازہر کو اپنا نقطۂ نظر تبدیل کرنے پر مجبور کر سکے۔ بہر حال میں نے اپنے جواب میں اپنی سمجھ کے مطابق تمام دلائل جمع کر دیئے۔ ہو سکتا ہے علماء کے ساتھ اپنی گفتگو میں، عمراوی نے، ان دلائل کو استعمال کیا ہو۔ الازہر یا تمام علمائے مصر کی طرف سے منظوری یا مذمت، میرے ترجمہ قرآن کو اس سے نہ تو کوئی فائدہ اور نہ ہی کوئی نقصان ہونا تھا لیکن اپنے قیامِ مصر کے اس زمانے کے مشاہدات کی روشنی میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ ماضی سے اب تک قرآنِ مجید کے ترجمہ کو غیر شرعی قرار دینے کا جو رویہ اختیار کیا گیا، اس سے الازہر کا مضحکہ ہی اڑا ہوگا اور میں پہلا شخص ہوں گا جسے اس پر افسوس ہوگا۔ الازہر ایک عظیم تاریخی درس گاہ ہے جس کو ہر شخص چاہے گا کہ اس میں اصلاح ہو اور تباہی نہ ہو۔ میں نے عمراوی سے کہا ہے کہ ان سے درخواست کریں کہ دوستوں کے ساتھ دشمنوں والا سلوک نہ کریں۔

بعد ازاں اخباری رپورٹوں کے ذریعے معلوم ہوا کہ میرے ترجمہ قرآن کا اس بگڑی ہوئی عربی میں ہی، جائزہ لے کر شیخ الازہر نے یہ اعلان فرمایا:

''اگر چہ یہ تمام تراجمِ قرآن میں سے بہترین ہے لیکن اس قابل نہیں ہے کہ مصر میں اس کو جائز سمجھا جائے۔''

پابندی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ میں نے عربی محاورہ اور استعارہ کا پیرایۂ اظہار اختیار کرنے کے طریق کی بجائے لفظی ترجمہ انگریزی میں کر دیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میں ان کے حقیقی معانی تک نہیں پہنچا۔ بڑی مسرت سے انہوں نے یہ ایک مثال پیش کی جس کا اقتباس اخبار میں دیا گیا تا کہ میں اپنے اوپر عائد ہونے والے الزام کو اچھی طرح سمجھ سکوں۔ میں نے سورہ بنی اسرائیل کی آیت انتیس (۲۹:۱۷) کا ترجمہ یوں کیا ہے:

وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۔

''اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے حد سے زیادہ کھول ورنہ تو ملامت کیا ہوا درماندہ ہو کر بیٹھ رہے گا۔''

"And let not thy hand be chained to thy neck nor open it with a complete opening, lest thou sitdown rebuked, denuded." (17:29)

شیخ الازہر نے خیال ظاہر کیا کہ اس طرح عربی الفاظ کا لفظی ترجمہ کر کے میں نے بخل اور فراخ دلی سے متعلق حکم کو ہاتھ کی پوزیشن سے متعلق حکم میں تبدیل کر دیا ہے جو بظاہر بے معنی بات لگتی ہے۔ میں ان کو یہ کیسے بتاؤں کہ انگریزی میں بھی ہم 'کھلے ہاتھ' اور 'بند مٹھی' کی اصطلاح انہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں جن معنوں میں یہ الفاظ قرآنِ مجید میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس طرح انگریزی پڑھنے والا ہر فرد میرے اس لفظی ترجمہ کو بالکل ٹھیک

باقی صفحہ نمبر ۱۷ پر ملاحظہ فرمائیں

جہاد کے احکامات اور مسلمانوں کا کردار

جنگ اُحد کے تناظر میں

از بیگم عنبرین زاہد بشیر ۔ کراچی

''اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں سے پیار نہیں کرتا اور (دوران جنگ) جہاں ان کو پاؤ مارو اور انہیں نکال دو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے اور فتنہ قتل سے بڑھ کر سخت ہے ...... پھر اگر وہ رک جائیں تو اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو پھر اگر وہ رک جائیں تو سزا ظالموں کے سوائے اور کسی کے لئے نہیں۔ (البقرہ ۲: ۱۹۰)

یہاں 'فی سبیل اللہ' جنگ کرنے کا ذکر ہے۔ یعنی ان لوگوں سے جنگ جو مذہبی آزادی کی بجائے ظلم و تشدد کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ کفار مکہ اسلام قبول کرنے والوں پر اس لئے ہر قسم کی سختی اور بربریت ڈھاتے تھے کہ اسلام کی خدائے واحد کی تعلیم سے ان کی بت پرستی پر سخت زد پڑتی تھی۔ اسلامی تعلیمات کا پرچار کسی سیاسی یا ملک گیری کا حصول نہ تھا بلکہ یہ سب کچھ تو کفار مکہ تو خود رسول اکرم صلعم کو دینے کو تیار تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں رسول اکرم کا اصل مقصد ان دنیاوی مقاصد کا حصول تھا۔ اس لئے قرآن مجید نے اس جنگ کو ''فی سبیل اللہ'' کہا یعنی اللہ کے دین کے استحکام کی خاطر جنگ جو ایمان لانے والوں پر مسلط کی جائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے جنگ بدر کے دن جو آپ کی پہلی جنگ تھی اللہ تعالیٰ سے ان الفاظ میں گڑگڑا کر دعا کی:

''اے خدا اگر تو نے اس چھوٹی سی جماعت کو ہلاک کر دیا تو زمین میں تیری پرستش پھر کبھی نہ ہوگی''۔ اور خود قرآن شریف میں دوسری جگہ اسی جنگ کی غرض کو یوں بیان کیا گیا ہے:

''وہ جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے، صرف اس بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ نہ ہٹاتا رہتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھریاں اور گرجے اور عبادگاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے گرا دی جاتیں۔ اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کے دین کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ طاقتور غالب ہے۔'' (حج ۲۲: ۴۰)

قرآن مجید کی مذکورہ آیات اور جنگ بدر کے موقع پر رسول اکرم صلعم کی دعا سے صاف عیاں ہے کہ قرآن مجید جنگ کی جس صورت کا ان آیات میں ذکر کر رہا ہے۔ اس میں مقصد مذہبی آزادی کا قیام اور دوسروں پر جنگ مسلط کرنے کے رجحان کا خاتمہ ہے اور یہ مذہبی آزادی کے لئے جدوجہد صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ تمام ادیان کے پیروکاروں کے لئے تھی۔ اسی لئے قرآن مجید ظلم و زیادتی کی جب انتہا ہو جائے اور مخالف حملہ آور ہو اس صورت میں جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن جنگ کی ان صورتوں میں بھی مسلمانوں کو خاص شرائط کی پاسداری کرنا لازم ہے۔ جن میں رحم، رواداری اور نیک سلوک کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ جن کو دنیاوی جنگوں میں اکثر بری طرح نظرانداز کیا جاتا ہے اور مفتوح قوموں پر ہر طرح کی ظلم و زیادتی کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مجید جنگ کے دوران اور بعد میں بھی مذہبی آزادی، امن، رواداری اور انسانیت کے اعلیٰ اقدار کو قائم کرنے کی تاکید کرتا ہے اور اس سلسلہ میں بعض شرائط کا بطور خاص ذکر بھی کرتا ہے۔

اسلامی جنگوں کا سب سے بڑا مقصد مذہبی آزادی اور امن کا قیام ہے۔ ان آیات میں جنگ کے سلسلہ میں دو واضح شرائط بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جارحانہ جنگ کا تصور اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ پھر جنگ میں جو لوگ شامل نہ ہوں یا جو جنگ کی ابتدا نہ کریں یا جو جنگ کے قابل نہ ہوں جیسے عورتیں، بچے، بیمار اور مذہبی علماء ان کے ساتھ بھی جنگ کسی طرح جائز نہیں۔

پھر یہ بھی شرط لگا دی گئی کہ حد سے نہ بڑھو یعنی حالت جنگ میں اپنے حق سے یا ضرورت جنگ سے تجاوز نہ کیا جائے اور اس طرح خواہ مخواہ اتلاف جان و مال کرنے سے گریز کیا جائے۔

اور سب سے اہم اور مشکل شرط یہ لگا دی گئی کہ اگر دشمن صلح پر آمادہ ہو تو اس میں کسی قسم کا لیت و لعل نہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں سورت بقرہ آیت ۱۹۲ میں یہ فرمایا ''کہ اگر وہ رک جائیں یعنی صلح کی طرف مائل ہوں تو تم نے صلح کی پیشکش کو ٹھکرانا نہیں۔ اس لئے کہ جنگ کا حکم تو اس لئے دیا گیا ہے کہ ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور دین کی وجہ سے ظلم و زیادتی کرتے ہیں۔ اس لئے اگر وہ اس ظلم و زیادتی نہ کرنے کی ضمانت دیتے ہیں تو پھر جنگ سے رک جاؤ اور صلح کر لو۔ صلح پسندی کے طریق پر چلنے کی اس سے زیادہ واضح ہدایت سورت انفال آیت ۶۱، ۶۲ میں یوں آتی ہے:

''اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تُو بھی اس کی طرف جھک جا اور

اللہ پر بھروسہ رکھ، وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر ان کا ارادہ ہو کہ تجھے دھوکا دیں، تو اللہ تجھے بس ہے۔ وہی ہے جس نے اپنی نصرت کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ تجھے قوت دی''۔ پیغمبرِ اسلام حضرت رسول اکرم صلعم کی طرف سے صلح حدیبیہ اسلامی جنگوں میں مسلمانوں کے مخصوص رویہ اور صلح کی طرف مائل ہونے کی درخشاں مثال ہے۔

سورت آلِ عمران آیت ۱۲۱ میں جنگ اُحد میں پیش آنے والے حالات و واقعات کا اجمالی طور پر یوں ذکر ہے۔ ''اور جب تو سویرے اپنے گھر والوں سے چلا۔ مومنوں کو لڑائی کے لئے مورچوں میں بٹھاتا تھا اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت سے تاریخی واقعات اور حقائق بیان کئے ہیں۔ ان کی تاریخی حیثیت اپنی جگہ لیکن قیامت تک ان کے ذکر کو محفوظ کرنے کا اصل مقصد میرے نزدیک یہ ہے کہ ان خصوصیات کو پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جن کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں پر اپنا فضل کیا اور دشمنوں کے مقابل میں کامیابی عطا فرمائی۔ اور مزید یہ کہ ان سے اپنے دنیاوی کاروبار اور زندگی کے دیگر معاملات میں رہنمائی حاصل کی جائے۔ جنگ اُحد میں دشمن کی طاقت اور تعداد مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھی اور یہ ایسی جگہ پر لڑی جانے والی تھی جس کے پشت پر ایک راستہ تھا جس سے دشمن کے اچانک حملہ کا خدشہ تھا۔ چنانچہ رسول اکرم صلعم نے ایک ذہین اور دوراندیش جرنیل کی طرح صورت حالات کا جائزہ لیتے ہوئے تیراندازوں کی ایک جماعت کو اس خاص جگہ پر متعین کر دیا اور تاکید کی کہ کسی صورت میں بھی آپ لوگوں نے اس جگہ کو چھوڑنا نہیں۔ اس جنگ میں اجتماعی کامیابی کے لئے تین رہنما اصول بتائے گئے ہیں۔ صحیح منصوبہ بندی، مقصد کے حصول کے لئے قوت ایمانی اور جذبہ جانثاری اور کامل تابعداری۔

اس آیت میں لفظ غَدَوْتَ استعمال ہوا ہے جس کے معنی دن کا آغاز یا سویرے کے ہیں۔ اگر ہم اس کو ذرا وسیع معنوں میں لیں تو انسانی زندگی کا آغاز بھی ایک سویرے کی طرح ہے جب انسان تازہ دم ہوتا ہے۔ اُس کے ذہن میں پورے دن کے لئے ایک پروگرام ہوتا ہے۔ جنگ بدر میں مومنوں کی قوت ایمانی اور جذبہ قربانی نے کامیابی حاصل کر کے ایک ایسے انقلاب کی صبح کو طلوع کر دی تھی جس نے مٹھی بھر مومنوں میں ایک ایسا ولولہ جذبہ قربانی اور اطاعت پیدا کر دیا جس کی بدولت مشکل سے مشکل حالات میں بے خوفی، بے مثال حوصلہ مندی، صبر اور بلا کی استقامت کا مظاہرہ ہوا اور یہی وہ خصوصیات تھیں جنہوں نے عرب میں اس روحانی انقلاب کی شروعات کیں جن کی بدولت اسلامی تمدن کی عمارت استوار ہوئی اور مسلمانوں نے ایک جاندار اور تاریخ ساز تمدن کو جنم دیا۔ رسول اکرم صلعم کی روح پرور ربانی تعلیمات نے اپنے ماننے والوں میں روحانی بصیرت اور بے مثال انقلابی قوت اور عزم پیدا کر دیا۔

مجاہدین بدر نے جنگ اُحد میں دشمن کی عددی برتری کو پس پشت ڈالتے ہوئے جذبہ ایمانی اور اللہ پر بھروسہ سے جو کامیابی شروع میں حاصل کی، ایک گروہ کی حکم عدولی کی وجہ سے فتح شکست میں بدل گئی۔ رسول اکرم صلعم زخمی ہو کر ایک گڑھے میں گر گئے۔ اس موقع پر آپؐ کے قریبی ساتھیوں نے جانثاری کا بے مثال نمونہ دکھایا اور اپنے محبوب رہنما کے لئے انسانی جسموں کا ایسا حصار بنا دیا کہ دشمنوں کے پے در پے حملے اس حصار کو نہ توڑ سکے اور دشمن پر اس جذبہ قربانی اور اپنی بے بسی کا یہ اثر ہوا کہ وہ خود ہی بھاگ کھڑا ہوا اور مومنوں میں ایسی جرأت پیدا ہوئی کہ انہوں نے اس حالت میں بھی ان کا تعاقب کیا۔ ان حالات میں مومنوں نے اللہ کی معجزانہ مدد کا ایسا مشاہدہ کیا کہ پھر فتح مکہ تک مسلمان ایک انتہائی متحد اور قوت ایمانی سے لبریز قوم کی صورت میں ہر مشکل کا سامنا کرتے رہے اور کامیابی ان کے قدم چومتی رہی۔ شہر مکہ اور اس کے طاقتور مخالفین جنہوں نے ایک وقت رسول اکرم صلعم اور ان کے ساتھیوں پر ظلم و تشدد کی انتہا کر دی تھی اور مسلمانوں کو مدینہ کی طرف اپنے تحفظ کے لئے ہجرت کرنا پڑی تھی وہ اب اسی شہر میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے لیکن یہ سب صبر، تحمل، عفو و درگزر کی اعلیٰ صفات کی بدولت ہوا اور بالآخر مسلمانوں کی اس انقلابی روح نے پورے جزیرۃ العرب کو اسلام کی آغوش میں لا ڈالا۔

آلِ عمران کی اسی آیت میں ایک اور اہم لفظ تُبَوِّئُ استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی ایسا مکان ہے جس کے اجزا میں مساوات ہو یعنی اس کی تعمیر میں یکسانیت اور مضبوطی ہو۔ مراد یہ ہے کہ جنگ اُحد میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسی جگہ دی کہ وہ اپنے قدم مضبوطی سے جما سکیں۔ یہاں جگہ سے مراد میرے نزدیک شہر مدینہ بھی ہو سکتا ہے جو نہ صرف رسول اکرم صلعم اور ان کے ساتھیوں کے لئے جائے پناہ تھا۔ بلکہ وہاں کے انصار نے مہاجرین کے ساتھ رشتہ اخوت کو اس قدر مضبوط بنا لیا تھا کہ وہ ہر موقع پر رسول اکرم صلعم کے لئے ایک حصار کا کام دیتے تھے اور اس مضبوط حصار کا نظارہ جنگ اُحد کے موقع پر دیکھنے میں آیا۔ پھر اس شہر مدینہ سے محبت، اخوت، وفاداری، جانثاری، توکل اور استقامت کے اجزاء اس طریق سے ایک مثالی قوم اور معاشرے کی تشکیل کرنے میں کامیاب ہوئے کہ جس نے عرب کی مذہبی اور تہذیبی شکل و صورت یکسر بدل دی اور علم و عرفان اور دانش کی روشنی جزیرہ نما عرب سے نکل کر دنیا میں پھیل گئی۔

مسلمانوں کی چھوٹی سی جمعیت جو اس شہر مدینہ میں واحدانیت اور نیک شعاری کا نمونہ قائم کرنے اور اس کی اشاعت کے لئے کوشاں تھی۔ ان کو کفار مکہ نے یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور پے در پے حملوں اور ریشہ

دوانیوں سے ان کو بے حوصلہ اور ناکام بنانے کی سر توڑ کوشش کی۔ جنگ اُحد میں رسول اکرم صلعم نے وہ قوم جو ان کے لئے انتہائی جانثاری اور کامل اتباع کا دم بھرتی تھی لیکن پھر بھی انہوں نے مشاورت کے فیصلہ کے تحت میدان احد میں کفار مکہ کا مقابلہ کرنے کے لئے کثرت کے فیصلہ کو مان لیا اور حالات کے پیش نظر ایک خاص تدبیر سے مورچہ بندی کی۔ ایک پہاڑی راستہ جس سے خدشہ تھا کہ دشمن عقب سے حملہ کر کے نقصان پہنچا سکتا تھا وہاں تیر اندازوں کی ایک جماعت کو متعین کیا اور انہیں حکم دیا کہ فتح یا شکست کسی حالت میں بھی انہوں نے مورچہ کو نہیں چھوڑنا۔ مگر بدقسمتی سے اس گروہ نے جسے عقب سے حملہ آوروں کے حملہ کو روکنا تھا، جنگ میں فتح کے آثار دیکھ کر مورچہ کو چھوڑ کر مال غنیمت کی طرف لپک پڑے اور اپنے فرض منصبی سے غافل ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن نے اس مورچہ سے عقب سے آ کر یکدم حملہ کر دیا اور مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ رسول اکرم صلعم ایک گڑھے میں گر گئے۔ ان کے دو دانت شہید ہو گئے لیکن اس انتہائی نازک صورت حالات میں رسول اکرم صلعم کے قریبی ساتھیوں نے ان کے گرد اپنی جانوں کا حصار بنا دیا۔ اور بھاگتے ہوئے صحابہ یکدم رسول اکرم صلعم کی حفاظت کے لئے واپس آ جاتے ہیں۔ دشمن اس غیر معمولی عزم اور جانثاری سے اتنا مرعوب ہو گیا کہ سراسیمگی کی حالت میں خود بخود بھاگ کھڑا ہوا۔ مسلمان جو کچھ دیر پہلے میدان چھوڑ کر جا رہے تھے اب ان میں اتنا حوصلہ آ گیا کہ نہایت پامردگی سے بھاگتے ہوئے دشمن کا تعاقب کرنے لگے اور یوں اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد نے ایک مرتبہ پھر اپنی جلوہ گری دکھائی اور شکست کو فتح میں بدل دیا۔

جنگ اُحد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ سبق بھی دیا کہ کسی مہم کے لئے آغاز سے اختتام تک صبر، استقلال، اخلاص اور جوانمردی سے فرائض منصبی کو ادا کرنا چاہئے۔ بعض حالات میں درمیان میں ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں کہ ہمت جواب دے جاتی ہے لیکن اگر استقلال اور پوری قوت ایمانی کے ساتھ کوشش کو جاری رکھا جائے تو اللہ کی مدد سے بالآخر کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ ہر ممکن کوشش اور قربانی کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی مدد پر مکمل بھروسہ کرے اور اس کے لئے خلوص سے دعائیں بھی کرے۔

آلِ عمران کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقت کے خطرات سے بھی آگاہ کیا ہے۔ اس میں لفظ قتل کے حوالے سے اخلاص اور نفاق کے درمیان فرق کی وضاحت کی گئی ہے کہ جس طرح قتل کے ذریعہ کسی شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور اس کی روح اور جسم کا تعلق ختم ہو جاتا ہے اسی طرح جنگ اُحد نے واضح طور پر مومن اور منافق کو الگ الگ کر کے دکھا دیا۔

عبداللہ بن ابی مدینہ کا اہم سردار تھا جو وہاں کے قبائل کی حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا لیکن جب رسول اکرم صلعم کی آمد اور میثاق مدینہ کے طے پا جانے سے سب نے متفقہ طور پر رسول اکرم صلعم کو اپنا حاکم اور منصف تسلیم کر لیا اور عبداللہ بن ابی کے حکمران بننے کا خواب منتشر ہو گیا۔ تو جنگ اُحد کے موقع پر اُس نے اُحد کے مقام پر پہنچنے سے پہلے ہی راستہ سے اپنے لوگوں کو لے کر واپس مدینہ لوٹ آیا کہ چونکہ رسول اکرم صلعم نے اس کا مشورہ نہ مانا تھا کہ جنگ مدینہ میں رہ کر کی جائے۔ اس لئے وہ جنگ میں شریک نہ ہوگا۔ ۳۰۰ ساتھیوں کو لے کر اس کا واپس ہونا جبکہ کل تعداد ۱۰۰۰ تھی۔ رسول اکرم صلعم اور ان کے ساتھیوں کے لئے سخت تشویشناک صورتِ حالات پیدا کر دی جبکہ دشمن کی تعداد ۳۰۰۰ کے قریب تھی لیکن اب مسلمانوں کو ان حالات میں ہی دشمن کا سامنا کرنا تھا۔ گو رسول اکرم صلعم نے اس موقع پر اکثریت کا فیصلہ مانا لیکن ایک ہوشمند جرنیل ہونے کے ناطے مخدوش صورت حالات کے پیش نظر آپؐ نے ایک کی بجائے دو زرہ پہنیں۔ پھر آپؐ نے صحابہ کی ایک جماعت کو عقب میں اس تنگ راستہ کی حفاظت کی تاکید فرمائی جس سے دشمن عقب سے حملہ کر سکتا تھا۔

ان انتہائی نامساعد حالات نے مومنوں میں زیادہ مضبوطی پیدا کی اور جب منافقوں نے عین وقت پر ساتھ چھوڑ دیا تو پھر پوری طرح اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے اور رسول اکرم صلعم کی ولولہ انگیز قیادت پر پہلے سے زیادہ اعتماد قائم ہو گیا۔ جنگ اُحد میں کثرت کے فیصلہ کو ماننا اور نتیجہ کو اللہ پر چھوڑنا ایمان اور استقامت کی ایک بے نظیر مثال ہے۔ انہوں نے مادی اسباب سے زیادہ اللہ کی نصرت پر بھروسہ کیا۔ وہ اللہ کی راہ میں بے خوف ہو کر لڑے اور شہادت کے متمنی ہوئے۔ ان کے نزدیک جنگ ہو یا امن ہر صورت میں اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل اور اس کی غیبی مدد پر یقین ان کی زندگی کا طریق بن چکا تھا۔

اس کے مقابل میں منافق ہر کام کرنے سے پہلے نفع و نقصان کو اوّلیت دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکامات اسے اس کے لئے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی جدوجہد کا معاوضہ ملنے کی امید رکھتا اور اگر اسے کوئی فائدہ ملنے کی امید نہ ہو تو عبداللہ بن ابی کی طرح عین وقت پر کوئی بہانا بنا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

آیت ۱۲۵ اور ۱۲۶ کے الفاظ میں مومن کے لئے صبر اور تقویٰ کو اللہ کی مدد کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> ''ہاں اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کرو اور وہ (دشمن) اپنے پورے جوش میں تم پر حملہ کریں۔ تمہارا رب پانچ ہزار (دشمن کو) تباہ کرنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا اور

باقی صفحہ نمبر ۲۳ پر ملاحظہ فرمائیں

تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں عورت کا اہم کردار

متن تقریر ۲۳ر دسمبر ۲۰۰۵ء بیگم شفق عمر سعادت، جامع دارالسلام، گارڈن ٹاؤن، لاہور

"اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر دیکھو تم انسان بن کر پھیل جاتے ہو۔ اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمہارے لئے تمہارے نفسوں سے جوڑے پیدا کئے تا کہ تم ان سے تسکین پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں جو فکر کرتے ہیں۔

اور اس کے نشانوں میں سے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے یقیناً اس میں علم والوں کے لئے نشان ہیں۔

اور اس کے نشانوں میں سے رات اور دن کو تمہارا سونا اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں جو سنتے ہیں۔

اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمہیں خوف اور اُمید کے لئے بجلی دکھاتا ہے اور بادل سے پانی اتارتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں پھر جب وہ تمہیں زمین سے ایک آواز دیکر پکارے گا تو تم فوراً نکل پڑو گے۔" (روم ۳۰: ۲۰ تا ۲۵)

محترم بزرگ خواتین، معزز بہنوں اور عزیز بچیو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اللہ تعالیٰ کی سلامتی، رحمت اور برکتیں آپ سب پر سایہ فگن رہیں۔

مجھے اسلام میں تبلیغ اسلام کی اہمیت کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ موضوع نہایت اہم ہے کیونکہ تحریک احمدیت کا بنیادی مقصد ہی اسلام کا دفاع اور اس کی تبلیغ و اشاعت ہے اور ہر احمدی کو اس مقصد کے حصول کے لئے مقدور بھر کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن میری ناچیز رائے میں اس دور میں ایک عورت اور پھر ماں ہونے کے ناطے سے ہمارے لئے اشاعت اسلام سے زیادہ تربیت اسلام کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔

تعلیم و تربیت میں کمی رہ جائے تو اشاعت اسلام کے لئے قوت، اہلیت اور استقلال ہماری آئندہ نسل میں پیدا نہ ہو سکے گا۔ یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ معاشرے کے ہر فرد کی ذمہ داریوں کی نوعیت بدلتی جاتی ہے۔ اگر اس کو مبالغہ نہ سمجھا جائے یا اس کو خواتین پرستی کا نام نہ دیا جائے تو میں بڑے فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو اولاد کی پیدائش اور پھر اس کی پرورش اور تربیت کے لئے جو قدرتی قویٰ، شفقت اور بے لوث خدمت کے اعلیٰ جذبات عطا کر رکھے ہیں۔ کوئی مصنوعی انتظام اب تک اس کا متبادل نہیں ہو سکا۔ پیدائش کے عمل سے ہی ایک فیملی کی ابتدا ہوتی ہے۔ ماں اور باپ دونوں بچے کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ماں کا پورا وجود بچے کی تخلیق اور تربیت کے عمل میں جسمانی اور روحانی دونوں لحاظ سے بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔

آج میڈیا کی یلغار ہم پر اور ہمارے بچوں کے فکر و عمل پر بھرپور طریق سے اثر انداز ہو رہی ہے۔ بے راہروی، فحاشی، بغاوت اور انتشار کا طوفان یوں امڈ کے آ رہا ہے کہ ہر حساس ذہن اور فکر مند دل اس کے بھیانک نتائج سے حیران اور پریشان ہے۔ اگر بچوں کو کوئی جگہ سکون، محبت اور بھلائی کا ماحول فراہم کر سکتی ہے تو وہ گھر ہے اور اگر اس گھر میں سکون، اعلیٰ اقدار، بھلائی اور رہنمائی فراہم ہو سکتے ہیں تو وہ والدین کا نیک نمونہ ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورت روم کی آیت ۲۱ میں والدین اور ان میں بطور خاص والدہ کو سکون، محبت اور رحمت کی فراہمی کا ذریعہ بیان کیا ہے۔ فرمایا: "اللہ کے نشانوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہارے نفسوں سے جوڑے پیدا کئے تا کہ تم ان سے تسکین پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں جو فکر کرتے ہیں"۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سورت روم کی آیات ۲۰ سے ۲۵ تک یعنی ۶ آیات، الفاظ مِنۡ اٰیٰتِہٖ سے شروع ہوتی ہیں یعنی یہ کہ ان آیات میں بیان کردہ حقائق اللہ کے نشانوں میں سے ہیں۔ گو ان حقائق کا کئی رنگوں میں بیان قرآن مجید کے مختلف مقامات پر بھی ہوا ہے لیکن یہاں من اٰیٰتِہٖ کے الفاظ سے سب سے پہلے انسان کی پیدائش کا ذکر شروع کیا ہے۔ دوسری آیت میں والدین کا

ذکر ہے جن کے ذریعہ پیدائش کا عمل آگے بڑھتا ہے اور پھر اسی آیت میں سکینت، محبت اور رحمت کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے جو پیدائش کے بعد اولاد کی نشوونما اور تربیت میں والدین کے ذریعہ ایک انتہائی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سکینت، محبت اور رحمت کی صفات کا نہ صرف اولاد کی تربیت کے لئے والدین میں ہونا ضروری ہے بلکہ خود معاشرے کی نشوونما اور تربیت کے لئے ان صفات کا افراد میں ہونا ضروری ہے۔

ان چھ آیات میں اللہ تعالیٰ کی وحدت کے لئے سب سے پہلے انسان کی پیدائش کو بطور نشان کے پیش کیا ہے اور پھر اس حوالے سے والدین میں سکینت، محبت اور رحمت کی خصوصیات کو پیدا کرنے کو دوسرے نشان کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ تین بقیہ آیات میں زبانوں اور رنگوں میں اختلاف، آسمان سے بارش کے ذریعہ زمین کو زندگی بخشنے کا عمل اور پھر آخر میں عناصر قدرت پر انسان کو تسخیر کی قدرت دینے کے ذکر کے ساتھ اس کے اعمال کا حساب لینے کے لئے قیامت کے قائم کرنے کا ذکر ہے تاکہ نیک اعمال کرنے والوں کو نیک اجر اور برے اعمال کرنے والوں کو سزا ملے۔ ایک رنگ میں اللہ تعالیٰ کے ان چھ نشانوں میں سے انسان جو کہ اشرف المخلوق ہے۔ اس کو سب سے پہلے رکھا ہے اور پھر عناصر قدرت کا ذکر کرتے ہوئے اسی انسان کو یوم حساب کا بھی احساس دلایا تاکہ یہ دنیا میں اپنا کردار صحیح انداز میں سرانجام دے اور اس میں امن وسکون قائم کرے اور فساد اور انتشار نہ پیدا ہو۔

انسان کی رہنمائی کے لئے اور اس کو بے راہروی سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی روحانی تربیت کے لئے خدائی احکامات کی فرمانبرداری کو ضروری ٹھہرایا ہے۔ جس طرح نظام کائنات اُس وقت تک قائم ہے جب تک ہر عنصر ایک منظم نظام کے تحت جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھا ہے چلتا رہے۔ اسی طرح انسان کی نشوونما اور ترقی کے لئے بھی اس نے قرآن مجید کی شکل میں ہدایت نازل کی اور رسول اکرم صلعم نے ان احکامات کا کامل نمونہ پیش کیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بھی رسول اکرم صلعم کی زبان سے یہ کہلوایا:

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ- وَ اُمِرْتُ لِاَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ-

ترجمہ: ''کہہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت اسی کے لئے خالص کرتا ہوا کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے بڑھ کر فرمانبردار بنوں۔'' (۳۹:۱۱،۱۲)

چنانچہ رسول اکرم صلعم نے انتہائی فرمانبرداری سے کامل نمونہ قائم کیا تو آپؐ نہ صرف احمدؐ سے محمدؐ بن گئے بلکہ تا قیامت وحدت الٰہی کے ساتھ آپؐ کے اسوہ پر ایمان کو اسلام کی قبولیت اور ایمان کے کامل ہونے کی شرط قرار دے دیا گیا۔

معزز بہنو! پھر ذرا اور آگے چلئے اور دیکھیں کہ اس کامل فرمانبرداری کے نتیجہ میں اللہ رحیم وکریم نے رسول اکرم صلعم کو کس رنگ میں ابدی انعام اور عزت افزائی فرمائی۔ سورت آل عمران میں اس مقام اور عزت افزائی کو ان سنہرے حروف میں درج کیا گیا ہے۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ-

ترجمہ: ''کہہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو کہ اللہ تم سے محبت کرے۔''

میری محترم سامعین بہنو! کامل نمونہ کے حصول کے لئے سخت اور صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ رسول اکرم صلعم کی زندگی کا ہر لحہ، ہر معاملہ، ہر بات، ہر کام، سوچنے کا انداز، خوشی اور غم کے مراحل، سب میں ان کا نمونہ قابل ستائش۔ تاریخ ان کی عظمت کی گواہی دے رہی ہے۔ مخالفین ان کی انسان دوستی اور اعلیٰ اخلاق کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔

خود رسول اکرمؐ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں جب آپؐ نے فرمایا کہ ''میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں''۔ تو میری محترم بہنو! اعلیٰ تعلیم وتربیت بنیاد بنتی ہے۔ اعلیٰ اخلاق واطوار کی اور ان کی نشوونما اور تبلیغ کے لئے کامل نمونہ کا ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے رسول اکرم صلعم کے فرائض کی نشاندہی کرتے ہوئے سورت بقرہ کی آیت ۱۵۱ میں یوں فرمایا:

''ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم پر ہماری آیتیں پڑھتا اور تم کو پاک کرتا اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ وہ تم کو وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے۔''

اس آیت شریفہ میں رسول اکرم صلعم کا ایک اہم فریضہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''وہ تم کو پاک کرتا ہے''۔ اس لئے آیت میں لفظ یُزَکِّیْکُمْ استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ زَکٰی سے بنا ہے جو قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً برکت، نشوونما، بڑھانا اور زمین کے لئے جب استعمال ہو تو اس سے مراد ہوتی ہے اچھی زمین جو اچھی فصل دے۔ دوسرے پیرائے میں اگر اس کو بیان کیا جائے تو اس سے مراد اچھی تربیت ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ماں بچے کی پرورش کے لئے بے مثال اور بے لوث خدمت کرتی ہے اور ایک تجربہ کار کمہار کی طرح اس کے کردار کی پاکیزگی اور عبادت گذاری یقیناً بچہ کے کردار کو ڈھالنے میں ایسا ہی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ سورت روم آیت ۲۰ میں ماں کی تین نمایاں صفات سکینت، محبت اور رحم کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہی صفات بچہ کی پرورش اور تربیت کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ رسول اکرم صلعم نے بچے کی تربیت کے سلسلہ میں ماں کے اہم کردار

کے پیش نظر کیا خوب فرمایا کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ لیکن سامعین! یہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے اسی صورت میں ہے کہ ماں صرف کہلانے کی حد تک ماں نہ ہو بلکہ حقیقی معنوں میں ماں بن کر دکھائے۔ گو عام طور پر اس سے یہی مطلب لیا جاتا ہے کہ اولاد ماں کی خدمت کرے تو جنت کماتی ہے لیکن حقیقت میں اس سے ماں کے کردار کی عظمت کی طرف بڑا واضح اشارہ ملتا ہے۔ حدیث میں ''قدموں کے نیچے'' کے الفاظ ایک نہایت خوبصورت استعارہ ہیں۔

سورت نور آیت ۹ میں لفظ تَحۡتَ کو اعمال کے نتائج لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں ان کا رب ان کے اعمال کی وجہ سے انہیں راہ دکھائے گا اور ان کو نعمتوں والے باغ عطا کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں''۔ اب نہریں باغ کے نیچے تو کبھی بہتی نہیں۔ نہریں تو ہمیشہ زمین کے اوپر یا زمین میں سے گزر کر جاتی ہیں۔ یقیناً اس سے مراد یہ ہے کہ ایسی زمین انتہائی زرخیز اور بے انتہا پھل اور فصلیں اگاتی ہے اور فضا کو خوشگوار اور طبیعت کو راحت پہنچاتی ہے۔ نہریں درحقیقت نتائج ہیں نیک اعمال کی۔ قرآن مجید میں نہریں یا باغ کے الفاظ تمثیل کے رنگ میں استعمال ہوئے ہیں۔

قدموں کے نیچے سے مراد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ چیز آپ کے قریب ہی ہے اور اس کو حاصل کرنے کی آپ میں استطاعت بھی ہے لیکن آپ کو اس کے حصول کے لئے شعور پیدا کرنا اور کوشش کرنا ہوگی۔

ماں اس جنت کو اس رنگ میں مہیا کر سکتی ہے کہ اولاد کی صحیح معنوں میں تربیت کرے اور خود نیک نمونہ دکھائے اور اولاد جنت یوں حاصل کر سکتی ہے کہ وہ والدین کی خدمت کا حق ادا کرے اور بڑھاپے میں ان کا ہر طرح خیال رکھے۔

میں نے شروع میں تبلیغ اسلام سے زیادہ تربیت اسلام کی اہمیت کی بات کی تھی اور میڈیا کے بڑھتے ہوئے اثرات کی طرف توجہ دلائی تھی اور اس بات کا بھی ذکر کیا تھا کہ گھر میں دن بدن والدین کو نیک ماحول پیدا کرنے اور مثالی نمونہ دکھانے کی بے حد ضرورت ہے کیونکہ صرف یہی ایک امن و سکون کی جگہ رہ گئی ہے جہاں بچوں کے فکر و عمل پر گہرے اثرات مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ ویسے بھی والدین بچوں کے لئے آئیڈیل ہوتے ہیں ورنہ میڈیا تو کالے علم، ستاروں کی گردش اور مختلف پتھروں کے اثرات کے بارے میں پروگرام دکھا کر ذہنوں کو الجھن میں ڈال رہا ہے اور نوجوان نسل خدا کی حاکمیت اور عبادت کے ذریعہ اندرونی اصلاح اور مستقبل سدھارنے کے لئے محنت، صبر اور استقلال کا رویہ اختیار کرنے کے طریقوں کی بجائے ''شارٹ کٹ'' توہم پرستی اور شک و شبہہ کا شکار ہو رہا ہے۔ اس لئے بہت ضروری ہے کہ جماعت بچوں کے ذہنوں کو ان الجھنوں سے بچانے کیلئے تربیتی پروگرام کا انتظام کرے اور گاہے بگاہے مختصر کتابچے یا مضامین ان موضوعات پر چھاپ کر بچوں اور ان کے والدین تک پہنچائے۔

لیکن محترم خواتین! والدین کا نمونہ اور بچوں کی تربیت کی ذمہ داری کا پورا حق ادا کرنے کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ اپنی زندگیوں کو نیک رکھنے سے بچوں کے نیک بننے کی امید کی جا سکتی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ سے ہر نماز میں یہ دعا مانگیں:

رَبَّنَا هَبۡ لَنَا مِنۡ اَزۡوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعۡيُنٍ وَّاجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِيۡنَ اِمَامًا۔ (۲۵:۷۴)

''اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں سے اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔''

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بچوں کی تربیت کے لئے ہمت اور استقامت عطا فرمائے تا کہ ہم اور ہماری اولاد برائیوں سے محفوظ ہے، نیکی کی روش اختیار کرے تا کہ اس کے نیک نمونہ سے اسلام کا نام روشن ہو۔

***

بقیہ — عرب اور غیر عرب دنیا

اسی مفہوم میں سمجھے گا کہ جس مفہوم میں عرب قارئین عربی متن کو سمجھتے ہیں اس لئے پابندی کی بنیاد غلط مفروضوں پر رکھی گئی ہے۔

میں ''الاہرام'' کی رپورٹ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ قرآن مجید کے ترجمہ کے ناجائز ہونے کے مسئلہ کے بارے میں شروع سے ہی وزارتِ امورِ داخلہ اور الازہر کے علماء کے درمیان اس بارے میں شدید اختلافات تھے۔ وزارتِ امورِ داخلہ میرے ترجمہ قرآن کے مستحسن ہونے کی غیر معمولی زور و شور سے حمایت کرتی رہی ہے لیکن شاہِ مصر کی پشت پناہی کی وجہ سے الازہر کا فیصلہ ان تمام معاملات میں حتمی سمجھا جاتا ہے۔

میرے ترجمہ کے رد کرنے کی اس کارروائی میں ایک حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ اس کے متعلق اظہارِ رائے میں حیران کن حد تک نرم لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ اگر شیخ الازہر کے سابقہ بیانات کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو اسے مترجم کے حق میں مفید کہا جا سکتا ہے۔ عربوں اور غیر عربوں کے تعلقات کی تاریخ میں یہ نئی روش ایک طویل باب کے بند ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اگر حیاتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایسا مسئلہ پیش آتا تو آپؐ اسے پسند نہ فرماتے۔ کیوں کہ صورت حال یہ ہے کہ اب یہ نظریہ دفن ہو چکا ہے کہ قرآنِ کریم کا مکمل ترجمہ کرنا گناہ ہے۔ اب ایک مسلمان کے ترجمہ کردہ قرآن کریم کا کم از کم جائزہ تو لیا گیا ہے اور اس کو رد کرنے کے لئے کم از کم ادبی دلیل دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک بڑی پیش قدمی ہے۔ ***

تحریک احمدیت دوسروں کی نظر میں......

حضرت خواجہ کمال الدین اور لارڈ ہیڈلے محمد یامین خان کی نظر میں

یہ ایک لارڈ تھے اور کچھ عرصہ ترکی میں رہے وہاں اسلام کی خوبیاں ان کو معلوم ہوئیں اور یہ مسلمان ہو گئے۔ لندن میں ایک جلسہ ہوا اُس میں انہوں نے اپنے مشرف بہ اسلام ہونے کا اعلان کیا لیکن چند صاحبان نے ان سے کچھ سوال اس قسم کے کیے جوان کو ناگوار گزرے اور انہوں نے کہا کہ میں مسلمان اپنی طبیعت سے ہوا ہوں چونکہ مجھ کو یہ مذہب سچا معلوم ہوا اور میں اس میں اپنی نجات سمجھتا ہوں۔ میں آپ کو خوش کرنے کے واسطے مسلمان نہیں ہوا اور میں نہیں سمجھتا کہ آپ کو کیا حق ہے کہ آپ مجھ سے یہ سوال کریں کہ میں کیوں مسلمان ہوا۔ مولانا ظفر علی خاں بھی ان سوال کنندوں میں تھے۔ چونکہ میری دوستی مولانا ظفر علی سے کافی ہوگئی تھی میں نے ان کو منع کیا کہ مزید سوال نہ کریں۔ مولانا ظفر علی خاں کے حالات کو جو اسمبلی کے زمانے سے متعلق ہیں وہ بعد کو لکھے جائیں گے لیکن لندن سے واپسی پر انہوں نے اپنے اخبار میں لندن کی بابت ایک شعر لکھا تھا جس پر انگریز حاکم ان سے ناخوش ہو گئے تھے

چار چیز است تحفۂ لندن
خمر و خنزیر روزنامہ و زن

لندن میں ہندوستانیوں میں زیادہ دوست دو چار تھے باقی میرے زمانے میں بہت تھے اور اُن سب سے دوستی رہتی تھی مگر خاص خاص یہ تھے پیر تاج الدین، سید ریاض الدین احمد، مسٹر خسرو الحق۔ ان کے علاوہ حیدر خاں، بدر الاسلام اور شہزاد احمد خاں، خواجہ ناظم الدین، ولی اللہ یونیورسٹی سے آتے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ خلیفہ شجاع الدین، خواجہ یٰسین امرتسری، آصف علی دہلوی، محمد صادق و صادق حسن امرتسری، سردار حبیب اللہ لاہوری، محمد امین لاہوری، پیر غیاث الدین برادر پیر تاج الدین، چودھری ظفر اللہ خاں، جلال شاہ (کرنل) سے بھی کافی ملاقات رہتی تھی اور چیٹرجی و دیس راج پوری اور بدر عالم سے بھی کافی دوستی تھی۔

(اقتباس از نامہ اعمال جلد اوّل صفحات ۲۰ تا ۲۳)

تفسیر ''بیان القرآن''

تبصرہ: محمد ارشد، مدیر اردو معارف اسلامیہ، جامعہ پنجاب (علامہ اقبال کیمپس) لاہور۔ شائع کردہ، سہ ماہی مجلہ ''فکر ونظر'' ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔ اسلام آباد (پاکستان) جلد:۴۱، شمارہ ۳، جنوری- مارچ ۲۰۰۴ء۔ عنوان: برصغیر میں تفسیر قرآن کا کلامی اسلوب، ص ص ۲۰، ۲۱۔

مولانا محمد علی لاہوری (م ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۱ء) امیر انجمن احمدیہ (لاہور) کی تفسیر ''بیان القرآن'' اعتزال جدید کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ سرسید نے احادیث و روایات کو نظر انداز کر کے محض عقل اور رائے سے قرآنی آیات کی تاویل وتشریح کی جو مثال قائم کی تھی اس کا بھرپور اتباع اس تفسیر میں کیا گیا ہے۔ محمد علی لاہوری نے بھی سرسید کی طرح تفسیر قرآن کے چند رہنما اصول وضع کئے ہیں۔ ان کا ماحصل یہ ہے کہ احادیث و روایات میں بیان باتیں واقعات، مشاہدہ یا مسلمہ تاریخ کے خلاف ہوں تو وہ قابل قبول نہیں۔ اسی طرح کوئی حدیث خواہ وہ صحاح ستہ کی ہو قابل قبول نہیں اگر قرآن کی صراحت کے خلاف ہو، یا اصول دینی کے خلاف ہو۔ قرآن کریم کی تفسیر کے سلسلہ میں صحابی سے اختلاف کرنا جرم نہیں۔ صحابہ میں خود آپس میں اختلاف ہے اور مفسرین نے بھی ان سے اختلاف کیا ہے۔ اقوال مفسرین اپنے عہد کے اثرات سے خالی نہیں ہیں لہٰذا ہمیں بھی اپنے زمانے کے علوم کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کرنی چاہیے۔

محمد علی لاہوری نے ان تفسیری اصول کو ''بیان القرآن'' میں خوب برتا ہے۔ انہوں نے احادیث و روایات، علمائے متقدمین کے مقرر کردہ اصول تفسیر، عربی زبان وادب کے قواعد اور قرآن کے مخاطبین اوّلین اور اہل زبان کے فہم سے دستبردار ہو کر آیات قرآنی کی ایسی تاویلات وتشریحات کی ہیں کہ حقائق غیبی، معجزات و مافوق الفطرت واقعات اور جدید سائنسی وعقلی نظریات و

معلومات میں کوئی تصادم باقی نہ رہے اور ان میں ایک گونہ تطبیق قائم ہو جائے۔ ''بیان القرآن'' میں دینی عقائد اور معجزات سے متعلق قرآنی آیات کی عقلی تاویلات کے علاوہ جہاد، ربا، تعدد ازدواج، نسخ قرآن اور قتل مرتد کے بارے میں معذرت خواہاں رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس تفسیر میں اسلام کو امن و آشتی کا علمبردار مذہب ثابت کرنے پر بڑی قوت صرف کی ہے اور مسلمانوں کے لئے انگریزی حکومت کی اطاعت وفرمانبرداری پر قرآنی آیات سے بھرپور استدلال کیا ہے۔ اس تفسیر میں جا بجا زرتشتی مذہب، ہندومت، یہودیت اور نصرانیت کے عقائد وتعلیمات اور مغربی تہذیب وتمدن کے بارے میں تنقیدی خیالات کے اظہار کے علاوہ مسلمانوں کے بعض فرقوں بالخصوص شیعہ کے اعتقادات پر نقد بھی کیا گیا ہے۔ تفسیر ''بیان القرآن'' کے مصنف مرزا غلام احمد قادیانی (م۱۹۰۸ء) کے ایک پیروکار بھی ہیں البتہ وہ مرزا صاحب کو نبی کے بجائے مجدد اعظم اور مصلح اکبر مانتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ''بیان القرآن'' میں متعدد مواقع پر مرزا صاحب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین اسلام کی تجدید و اصلاح پر مامور ایک مجدد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے الہامات و مکاشفات کی اطاعت و پیروی کو امت مسلمہ پر لازم و واجب کیا ہے۔

مولوی محمد علی لاہوری نے انگریزی زبان میں بھی قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیری حواشی تحریر کئے ہیں۔ اس ترجمہ وتفسیر میں بھی جدید علم کلام کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ اس تفسیر کی تصنیف میں بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی ''جدید مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہنیت کو خصوصی طور سے پیش نظر رکھا گیا ہے تاکہ مغربی علوم وافکار کی راہ سے آئے ہوئے شکوک وشبہات کو دور کیا جا سکے'' تاہم اس میں بھی مصنف کی بعض تاویلات وتشریحات ایسی ہیں جن کے ڈانڈے تحریف سے مل جاتے ہیں۔ بایں ہمہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی، محمد علی لاہوری کے اس انگریزی ترجمہ اور تفسیری حواشی میں تہذیب مغرب پر ان کی تنقید کے بڑے مداح نظر آتے ہیں۔

حضرت خواجہ کمال الدین صاحب، بانی ووکنگ مسلم مشن، انگلستان محمد یامین خان صاحب کی نظر میں

(اقتباس از نادر اعمال جلد اوّل مصنفہ محمد یامین خان شائع کردہ: آئینہ ادب، چوک مینار، انارکلی، لاہور۔ ۱۹۷۰ء طبع شدہ: اشرف پریس، لاہور-ص ص۲۰-۲۳)

یہ نہایت عمدہ عالم فاضل اور صحیح دماغ رکھنے والے صاحب تھے۔ یہ پہلے وکالت کرتے تھے لیکن بعد میں وکالت چھوڑ کر مسلم مشنری بن گئے تھے۔ انہوں نے لندن جا کر ووکنگ مسجد پر بڑی مشکل سے قبضہ حاصل کیا۔ مسجد نہایت وسیع احاطہ میں ہے اور اس کے ساتھ دو کوٹھیاں تھیں جن پر اُس شخص ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر (کا بیٹا) نے قبضہ کر رکھا تھا ڈاکٹر لائٹنر نے (ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں خاص طور پر بیگم بھوپال اور حیدرآباد دکن کے سر سالار جنگ سے) چندہ جمع کر کے یہ کوٹھیاں اور مسجد تعمیر کی تھی۔ بہت مشکل سے مسجد اور ایک چھوٹی کوٹھی پیش امام کے واسطے ملی۔ دوسری پر وہی قابض رہا۔ خواجہ کمال الدین صاحب کی کوشش کا یہ نتیجہ تھا۔ ان کی امداد سید امیر علی، مرزا عباس علی بیگ اور ہز ہائی نس سر آغا خاں نے بھی کی۔ جب یہ مسجد مل گئی تو بہت سے مسلمان طالب علم و دیگر مسلمان ایک جمعہ کو وہاں گئے اور نماز ادا کی۔ ووکنگ لندن کے وسط سے تقریباً تیس چالیس میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں ریل سے جانا ہوتا تھا جس میں وقت بھی لگتا تھا اور خرچ بھی ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب نے جملہ صاحبان کو جو نماز کو گئے لنچ پر پلاؤ اور پڈنگ کھلایا۔ ہندوستانی طالب علموں کا پلاؤ کی دعوت سے بڑھ کر کوئی کھانا نہیں ہوتا تھا۔ خوب پلاؤ پر ڈٹے اور پھر پڑ کر مسجد میں اور لان پر سوئے۔ عصر کی نماز پڑھ کر چائے پی اور کیک پیسٹری خواجہ صاحب نے دی۔ مغرب کی نماز کے وقت واپس ہوئے۔ اس کے بعد سے عید اور بقرعید کو سب ووکنگ جا کر نماز پڑھتے تھے۔ مگر چونکہ ہر جمعہ کو ووکنگ جانا مشکل تھا اس لئے خواجہ صاحب جمعہ کے دن (لندن میں) کیکسٹن ہال لے لیتے تھے اور سب طالب علموں سے کہہ رکھا تھا کہ خود بھی آویں اور اپنے ساتھ انگریز مرد اور عورتوں کو لائیں۔ مسلمان فرش پر نیچے بیٹھتے تھے اور انگریز مرد اور عورتوں کو کرسی پر بٹھا دیا جاتا تھا۔ خواجہ صاحب نماز کا خطبہ انگریزی میں دیتے تھے جو علی العموم اُن آیتوں کا ترجمہ اور تشریح ہوتی تھی جو وہ نماز کی دو رکعتوں میں پڑھتے تھے اور یہ وہ آیتیں ہوتی تھیں جن کے ذریعہ اسلام کی فوقیت دوسرے مذاہب پر ظاہر ہوتی تھی اور اشاعت اسلام کی جاتی تھی۔ ان کی تقریر سن کر اکثر انگریز مرد اور عورتیں متاثر ہوتی تھیں۔ عورتوں کے دلوں میں پادریوں نے یہ تعصب بھر رکھا تھا کہ مسلمان چار بیویاں رکھتے ہیں اور جو عورت مسلمان ہو جائے گی وہ چار بیویوں میں سے ایک ہو گی۔ خواجہ صاحب نہایت قابلیت سے اس تعصب کو دور کرتے تھے۔ رمضان جون کے مہینہ میں ہوا۔ لندن میں رات کو ایک یا ڈیڑھ بجے پو پھٹ جاتی ہے اور صبح کاذب شروع ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں خاصا اجالا ہو جاتا ہے جیسا کہ سورج نکلنے سے ایک گھنٹہ قبل یہاں ہو جاتا ہے اور صبح کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ ساڑھے تین بجے سورج نکل آتا ہے اور رات کو ساڑھے آٹھ بجے غروب ہوتا

ہے۔ دس بجے تک رات کو مغرب کا وقت رہتا ہے اور اس قدر روشنی ساڑھے نو بجے تک رہتی ہے کہ ہم ٹینس کھیلتے تھے۔ ایسی حالت میں اگر روزہ رکھا جاوے تو صرف افطار کے وقت ساڑھے آٹھ بجے کھانا کھایا جاسکتا تھا اور سحری کھانے کا کوئی وقت نہ تھا جو ایک بجے رات کو ختم ہو جاتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ مشکل سویڈن ناروے میں تھی جہاں سورج تین دن تک نہیں چھپتا اور آسمان پر اوپر ہی اوپر تین دن گھومتا ہے۔ لندن سے بہت لوگ آدھی رات کو سورج دیکھنے جاتے تھے۔ ایسی حالت میں روزہ کس قدر دیر کا رکھا جاوے اس پر فتوے کی ضرورت تھی۔ میں نے خواجہ صاحب کے سامنے پیش کیا کہ رسول اللہ کے زمانے میں لوند کا مہینہ ہوتا تھا جس سے قمری مہینے شمسی مہینے کے مطابق ہوتے تھے جس طرح یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے مہینے قمری ہیں لیکن ان میں ہر تین سال بعد ایک لوند کا مہینہ شامل کر کے پھر قمری مہینوں کو شمسی مہینوں کے مطابق کر دیا جاتا ہے۔ حجۃ الوداع کی تاریخ سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں رمضان ہمیشہ اخیر اکتوبر سے لے کر نومبر کے مہینے کے درمیان تک ہوتا رہا جب کہ دن اور رات برابر ہوتے ہیں اور وہی زمانہ ہے کہ انسان کے دل پر روحانیت کا اثر ہوتا ہے۔ قرآن شریف رمضان میں نازل ہوا جیسا قرآن خود کہتا ہے اور غار حرا سے واپسی پر رسول اللہؐ نے خدیجۃ الکبریٰ سے کہا کہ مجھ کو کمبل اوڑھا دو سردی لگتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ رمضان معتدل موسم میں ہوا کرتا تھا کہ شب قدر بھی معتدل موسم میں ہوتی۔ رسول اللہؐ کی وفات کے دس بارہ سال بعد حضرت عمرؓ کے زمانے میں سن ہجری بنا جس میں مسلمانوں نے علم فلکیات اور قدرتی اصول کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس زمانے میں صبح سے شام تک روزہ رکھنے کا حکم دیا جب دن اور رات برابر ہوں نہ کہ ہم مصنوعی طریقہ سے اُس اصول کو مٹاویں۔ پھر قطب شمالی اور قطب جنوبی پر دن اور رات چھ چھ ماہ کے ہوتے ہیں۔ چونکہ اسلام تمام دنیا کے واسطے ہے وہاں کے مسلمان کیا کریں گے۔ ہم کو ایسا راستہ سوچنا چاہئے جو خداوندی احکام کو خارج نہ کرے اور قرآن کا مفہوم اس طرح سمجھا جائے کہ اُس پر یہ الزام نہ آئے کہ قرآن تو جاہل عربوں کو ٹھیک کرنے کے واسطے ہے نہ کہ ترقی یافتہ یورپ کے واسطے جیسا کہ مفسد پادری پراپیگنڈا کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے میری گفتگو سن کر اگلے دن فیصلہ دینے کے واسطے کہا اور اگلے دن کہا کہ بھئی لڑکے تم یہ کرو کہ صبح ساڑھے آٹھ سے پہلے ناشتہ کھا لو اور پھر رات کو ساڑھے آٹھ پر روزہ افطار کر کے کھانا کھا لو۔ بیچ وقت میں نہ کچھ کھاؤ نہ پیو تمہارا روزہ ہو جائے گا۔ اللہ دل کو دیکھتا ہے نہ کہ رسم کو۔ مگر میں خود پورا روزہ رکھوں گا اور رات کو بارہ بجے کھاؤں گا۔ یہ فیصلہ لڑکوں کے واسطے نہایت عقلمندانہ تھا۔ ہم لوگ یہ قطعی نہیں جانتے تھے اور سب ساتھ رہتے تھے کہ قادیانی کون ہے اور سنی کون ہے اور شیعہ کون ہے۔ ہم سب لڑکے اپنے آپ کو صرف مسلمان سمجھتے تھے اور سب ساتھ نماز پڑھتے تھے اور اسلام کو اپنا مذہب سمجھ کر سب یکجہتی سے رہتے تھے فرقہ بندی کی بلا وہاں نہیں تھی۔

قادیانیوں کو مولانا مودودی کا مشورہ

(اقتباس از ''زندگانی کی گزرگاہوں میں'' ملک نصر اللہ خان عزیز کی اخبار ''تسنیم'' میں شائع شدہ مضامین کا انتخاب مرتبہ اختر حجازی۔ شائع کردہ: تسنیم پبلی کیشنز، چوک اردو بازار، لاہور۔ ستمبر ۱۹۹۴ء، ص ص ۲۸۹-۲۹۶)۔

اگر ۵۲ء میں قادیانی جماعت کے سربراہ مولانا مودودی کا مشورہ قبول کر لیتے تو وہ خلیج پاٹی جا چکی ہوتی جو اب تک ملت کے علی الرغم انف حائل ہے اور جس نے وحدت ملت کی دیوار میں رخنہ ڈال رکھا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروؤں سے مسلمانوں کو کوئی چالیس برس سے یہ شکایت تھی کہ وہ مرزا صاحب کو ماننا جزو ایمان قرار دے کر ایک ایسی صورت حال پیدا کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین پر ایمان ان کے نزدیک بے کار تصور ہو رہا ہے۔ حالانکہ اسلام کی بنیادی تعلیم کی رو سے ایمان و نجات کی ایک ہی شرط ہے (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) اللہ کی توحید پر ایمان اور محمد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان۔ اس قول کے بعد ایک شخص دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے اور اسے کسی اور شخص یا فرد پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن اگر مرزا صاحب کا ماننا بھی جزو ایمان تسلیم کر لیا جائے تو پھر (لا الہ اللہ محمد رسول اللہ) کا اقرار اس وقت تک بے کار ہو جاتا ہے جب تک کوئی شخص مرزا صاحب کے دعاوی پر بھی ایمان نہ لائے۔

یہ ایک بڑی عجیب پوزیشن تھی۔ برطانوی اقتدار کے دور میں اس قسم کی صورت حال سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن پاکستان بن جانے کے بعد جب کہ اس اسلامی مملکت کے استحکام کے لئے فرقہ بندی کے جملہ اسباب کو ختم کرنا ضروری تھا، اس قسم کی ''تفریق'' کو باقی رکھنا مناسب نہیں رہا تھا۔ اس سے خواہ مخواہ ایک کشمکش جاری رہتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور فرد پر بھی ایمان لانا جائز ہے یا نہیں۔ بلکہ خود مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے متبعین میں سے بھی ایک گروہ (یعنی لاہور گروپ- ناقل) کا مؤقف یہ تھا کہ یہ جائز نہیں اور اس مؤقف کے لئے وہ خود مرزا صاحب کے ''مذہب سے'' استدلال کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا، مرزا صاحب نے خود کہا ہے:

ابتدا سے میرا یہی مذہب ہے کہ میرے دعوے کے انکار کی

وجہ سے کوئی شخص کافر یا دجال نہیں ہو سکتا۔ (تریاق القلوب)

ظاہر ہے کہ جب دعوے کے انکار کی وجہ سے کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا تو اس کا ماننا جزو ایمان نہ رہا۔

مباحثہ راولپنڈی

لیکن اس کے برعکس مرزا صاحب ہی کے متبعین کا ایک دوسرا گروہ جسے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اعتقاد رکھتا تھا، کہ مرزا صاحب کا انکار کرنے والے دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور اس عقیدے کی بنیاد وہ بھی مرزا صاحب ہی کی تحریروں پر قائم کرتا تھا۔ یہ بحث ان دونوں گروہوں میں ۱۹۱۴ء سے شروع ہوئی اور اب تک جاری ہے۔ اگر اس کا پورا لطف اٹھانا ہو تو ''مباحثہ راولپنڈی'' کی روداد کا مطالعہ کیجئے جو ۲۰ جون سے ۲۶ جون ۳۷ء تک ہوا اور جس میں قادیانی فریق اور لاہوری فریق کے باقاعدہ نمائندہ مناظر ''اختلافی'' مسائل پر بحث کی جنگ کرتے رہے اور جس میں دونوں طرف سے دلائل کا ''گولہ بارود'' خود مرزا صاحب کی تحریروں اور میگزین سے لیا گیا تھا۔ اس مباحثہ کی تقریریں کتابی صورت میں دونوں فریقوں کی تصدیق کے ساتھ شائع کی جا چکی ہیں۔ اس مناظرے میں ایک موضوع یہ تھا کہ ''مرزا غلام احمد صاحب کے دعوے کا انکار کرنے والے کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں یا نہیں؟'' لاہوری گروہ کہتا تھا ''نہیں''۔ قادیانی گروہ کہتا تھا ''ہاں''۔ لاہوریوں نے کہا، مرزا صاحب فرماتے ہیں:

> ''ابتدا سے میرا یہی مذہب ہے کہ میرے دعویٰ کے انکار کی وجہ سے کوئی شخص کافر یا دجال نہیں ہو سکتا۔''

اور قادیانی گروہ کے متعلق لاہوری جماعت کے مناظر نے پہلے پرچے میں لکھا تھا:

> ''مگر جماعت احمدیہ قادیان اس امر کی قائل ہے کہ حضرت مسیح موعود کے دعویٰ کا انکار کرنے والے کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ جس شخص کے پاس حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہ پہنچا ہو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے جب تک کہ آپ کی بیعت نہ کرے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حضرت کو دل میں سچا بھی سمجھتا ہو مگر جب تک زبانی بیعت کا اقرار نہ کرے دائرۂ اسلام سے خارج ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم غیر احمدی لوگوں کو کافر سمجھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ و حضرت محمد صلوٰت اللہ علیہم اجمعین کا منکر کافر ہے بعینہٖ اسی طرح حضرت مرزا صاحب کا منکر دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔''
>
> (مباحثہ ص ۲۱۶)

اس کے جواب میں قادیانی مناظر نے استدلال کی عمارت یوں اٹھائی:

> ''سب سے اوّل یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت مسیح موعود کون تھے اور ان کے منکر کے متعلق اس سوال کی کیا وجہ ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر حضرت مسیح موعود معمولی مومن ہیں اور ان کا کوئی دعویٰ نبوت و ماموریت نہ ہو تب نہ ان کا ماننا فرض ہو گا اور نہ ہی ان کے منکر کے متعلق کسی سوال کی ضرورت ہے اور اگر ان کا دعویٰ ایک عظیم الشان دعویٰ ہے اس لئے ان کا ماننا ضروری اور فرض ہے۔''

یہ مناظرہ ختم ہو گیا۔ مگر بحث پھر بھی جاری رہی۔ یہاں تک کہ پاکستان بنا ''ملت اسلامیہ'' آزاد ہوئی۔ اسلامی دستور کا غلغلہ بلند ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ مجلس احرار نے تحریک ختم نبوت جاری کی اور قادیانیوں کو اس بنا پر مسلمانوں سے الگ کرنے کا مطالبہ پیش کر دیا کہ یہ گروہ مسلمانوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیتا ہے اور نبوت محمدیؐ کے بعد ایک نئی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت کا علمبردار ہے۔

نازک دور

یہ بڑا نازک دور تھا۔ ملک میں اسلامی دستور کا مطالبہ پوری قوت سے جاری ہو چکا تھا اور ایک ضمنی مسئلے کو چھیڑ دینا اصل مطالبے کو مخمصے میں ڈالنے کا باعث ہو سکتا تھا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے تو اس شبہے کا اظہار بھی کیا کہ یہ تحریک بعض ہوشیار سیاستدانوں کی الہام کی ہوئی ہے۔ یہ ایک دام ہم رنگ زمین ہے جسے بعض چالاک لوگوں نے بچھایا ہے اور مجلس احرار کے سادہ دل بندے اس میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف یہ مسئلہ قادیانیوں کے لئے بھی بڑی نزاکت کا حامل تھا۔ اگر ان کو ان کے عقائد کی پاداش میں مسلمانوں سے الگ کر دیا جاتا ہے تو ان کے لئے اس ملک میں پھیلنے اور بڑھنے کے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ پریشانی ان لوگوں کو لاحق ہوئی جو اسلامی دستور کی ترتیب اور اس کے نفاذ میں اسلام کے غلبہ و احیاء کا راز دیکھتے تھے اور جو یہ جانتے تھے کہ اگر ملک کا دستور اسلامی اصولوں کے مطابق بن جائے اور اس کی زندگی کی گاڑی اسلام کی شاہراہ پر چل پڑے تو وہ تمام ضمنی مسائل اور مباحث آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں۔ جنھوں نے امت مسلمہ کی بے پناہ قوتوں کو مفلوج کر کے اور اسے کلامی بحثوں میں الجھا کر رکھ دیا ہے۔

ہر شخص کو معلوم ہے کہ اسلام کی تجدید و احیاء کی اس مہم کے سرخیل مولانا

مودودی تھے۔ سب سے زیادہ پریشانی انہی کو ہونی چاہئے تھی اور ہوئی۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس مرحلے پر مولانا نے اپنی قوم اپنے ملک اور خود قادیانیوں کے ساتھ سب سے زیادہ بھلائی کرنے کی کوشش کی۔ جب کسی شخص کی منزل مقصود متعین ہو تو وہ راہ عمل کے تعین میں بھی دشواری محسوس نہیں کرتا۔ راہ عمل کے بارے میں ہمیشہ ان لوگوں کو پریشانی پیش آتی ہے جن کے سامنے ان کی منزل مقصود واضح نہیں ہوتی۔ مولانا کی منزل مقصود اسلام کا احیاء اور اقامت دین تھی۔ اس کی راہ عمل اسلامی دستور تھا اور اس راہ میں جو مشکلات حائل ہو سکتی تھیں ان کا خوب اندازہ تھا۔ اس لئے انہوں نے سب سے پہلے قادیانیوں کی طرف توجہ کی اور ان کو مشورہ دیا کہ ان اسباب کو رفع کرنے کی کوشش کریں جو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان مستقل نزاع کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ یہی ''شرائط ایمان'' کا مسئلہ تھا۔ اگر یہ لوگ مرزا صاحب کو ماننا جزو ایمان قرار دینے سے باز آ جائیں تو اس کے بعد معاملہ محض کلامی اور اجتہادی بحثوں کا رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد کوئی شخص مرزا صاحب پر ایمان لاتا ہے یا نہیں لاتا، اس کی بحث باقی نہیں رہتی بلکہ تمام تر بحث یہ رہ جاتی ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے ہیں اس کو عملاً برپا کیا جائے۔ غالباً مولانا یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ اپنی بعض کلامی اور اعتقادی گمراہیوں کے باوجود ان لوگوں کا عام طبقہ دینی مزاج رکھتا ہے اور وہ ایک اسلامی ریاست کی بہترین رعایا بن سکتا ہے بہ نسبت ان مغرب زدہ اور دین سے باغی لوگوں کے کہ جن کی عیش پرست زندگی کا دم اسلامی نظام حیات کی پاکیزہ فضاؤں میں گھٹنے لگتا ہے اور جو اسلامی دستور کا نام زبان پر لاتے ہوئے شرم کے مارے زمین میں گڑھے جاتے ہیں، اس لئے اگر یہ لوگ کم از کم اس مقام ہی پر آ جائیں جس پر ان کا اپنا ایک گروہ آ چکا ہے تو ان کو مسلمانوں سے الگ ملت قرار دینے کے مطالبے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور مسلمانان پاکستان کی توجہات اسلامی دستور کے مطالبے سے نہیں ہٹنے پائیں گی اور اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ اس مطالبے پر پوری قوم پوری یکسوئی سے جم جائے۔

دستوری مطالبے کی برکات

یہ اسی دستوری مطالبے کی برکت تھی کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کی نزاعیں ختم ہو گئی تھیں اور ان کے علماء نے متفقہ طور پر ایک دوسرے کے بارے میں تکفیر و تفسیق کے فتوؤں کو عملاً واپس لے لیا تھا۔ شیعہ اور سنی اور سنیوں میں سے حنفی، بریلوی، اہلحدیث سب ایک صف میں کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مولانا سید ابوالحسنات مرحوم کی اقتدا میں مولانا محمد داؤد غزنوی نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں نے حافظ کفایت حسین صاحب کو مطالبہ اسلامی پر اتفاق کرتے ہوئے یہ الفاظ کہتے ہوئے سنا کہ اگر اسلامی نظام پاکستان میں نافذ ہو جاتا ہے تو ہمیں اس کی پرواہ نہیں، اگر ہمیں دیواروں میں چنوا دیا جائے (اور غالباً یہ بعض شیعہ معترضوں کے اس شبہے کا جواب تھا کہ پاکستان میں سنیوں کی اکثریت ہے، اگر یہاں اسلامی دستور نافذ ہو گیا تو شیعوں کے لئے اپنے عقائد پر قائم رہنا دشوار ہو جائے گا)۔

اصل یہ ہے کہ جب اسلام کے مجموعی مفاد کا سوال پیدا ہوتا ہے تو فرقہ بندی کی وہ تمام فصلیں زمین بوس ہو جاتی ہیں جو بعض مسلمانوں کی کوتاہ نظری اور تعصب نے کھڑی کر دی ہیں۔ یہ تفرقہ پردازیاں اپنا سر ہی اس وقت اٹھاتی ہیں جب اسلامی نظام حیات کا سوال پس پشت جا پڑتا ہے اور مسلمان علماء کے لئے فقہی جھگڑوں کو ہوا دینے کے سوا اور کوئی کام باقی نہیں رہتا۔ چالاک سیاست دان اور خود غرض امراء ان کو اپنی ہوا و اغراض کا آلہ کار بنا لیتے ہیں۔

مولانا مودودی کا پیغام

بہر حال مولانا نے ایک مشترک دوست کے ذریعے قادیانیوں کو پیغام دیا اور ان کا ایک وفد ایک روز مولانا سے ملا۔ مولانا مودودی نے ان کے سامنے صورت حال کی نزاکت پوری وضاحت اور دردمندی کے ساتھ رکھی لیکن برا ہو جماعتی تعصب اور کوتاہ نظری کا، وہ لوگ اپنے موقف میں تبدیلی کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے اور جو ملکی اور سیاسی حالات اس وقت برپا تھے ان کی موجودگی میں ان سے معقولیت اختیار کرنے کی توقع بھی نہیں رہی تھی۔ سر ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ تھے۔ وزارت و حکومت میں قادیانیوں کا اثر و رسوخ تھا اور وہ بلوچستان کو ''احمدی صوبہ'' بنا کر لمبے چوڑے خواب دیکھ رہے تھے۔ پھر ان کا امام اعلان کر چکا تھا کہ:

> احمق ہے جو یہ کہتا ہے کہ مسیح موعود کا ماننا جزو ایمان نہیں۔
> کس کا دل گردہ ہے جو یہ کہے کہ مسیح موعود کا ماننا جزو ایمان نہیں۔ (الفضل ۶ رمئی و ۲۱ رمئی ۱۹۱۴ء بحوالہ پیغام صلح ۲۴ رمئی ۱۹۶۱ء)

چنانچہ مولانا مودودی کی کوشش ناکام ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لئے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ مولانا مودودی ہی کی اس کوشش کے باوجود کہ اس قضیئے کو طے کرنے کے لئے سول نافرمانی کی قسم کے طریقے اختیار نہ کئے جائیں لیکن سول نافرمانی شروع کر دی گئی۔ ہوشیار لوگوں نے اسے امن و قانون کا معاملہ بنا دیا۔ مارشل لاء لگا اور خدا کے زبردست ہاتھ نے ساری صورت حالات کا رخ تحقیقاتی عدالت کی طرف موڑ دیا۔

تحقیقاتی عدالت نے جو رپورٹ مرتب کی وہ تو ایک قصہ پارینہ بن چکی ہے اور غالباً اس کی یاد بھی لوگوں سے محو ہو گئی ہے لیکن جو پائیدار نقش اس

نے لوح حالات پر چھوڑا وہ یہ تھا کہ ''مرزا صاحب کو ماننا جزو ایمان ہے یا نہیں''۔ اس کے متعلق خود قادیانی جماعت کے خلیفہ نے اپنے پہلے مؤقف سے رجوع کر لیا۔

جس زمانے میں تحریک ختم نبوت جاری تھی مرزا محمود احمد صاحب نے ایک تقریر میں اعلان کیا تھا کہ:

> اگر یہ لوگ جیت گئے تو ہم جھوٹے ہیں لیکن اگر ہم سچے ہیں تو یہی لوگ ہاریں گے۔ (الفضل ۱۵ر جنوری ۵۳ء)

تحریکوں کے متعلق ''جیت ہار'' کا معیار یہ نہیں کہ وہ پوری منطقی نوعیت سے کامیاب ہوں یا ناکام بلکہ یہ ہے کہ ان کا مقصود پورا ہو جائے۔ مجھے دوسروں سے بحث نہیں مگر ہمارا مؤقف یہ تھا کہ وہ سبب دور ہو جائے جو قادیانیوں اور مسلمانوں کے مابین کشمکش کا باعث ہے۔ اگر قادیانی مرزا صاحب کی وجہ سے مسلمانوں کی تکفیر کرنے سے ہاتھ اٹھالیں تو یہ کشمکش دور ہو جاتی ہے لیکن اگر تکفیر کی خلیج حائل رہے تو پھر کشمکش بھی جاری رہتی ہے اور دو ایسے گروہ جو مسلمان ہونے کے مدعی ہوں، مگر ایک دوسرے کو اصولاً کافر کہتے ہوں، ایک امت نہیں بن سکتے اور اس تحریک میں جیت ہار کا معیار بھی یہ تھا کہ قادیانی مرزا صاحب کے ماننے کو جزو ایمان قرار دینے سے باز آ جائیں۔ اس سلسلے میں لاہوری جماعت کے اخبار ''پیغام صلح'' سے ایک مضمون کا اقتباس درج کرنا کافی ہوگا۔ سبط نور (غالباً مولوی نورالدین صاحب کے کوئی صاحب زادے) ''قادیانی خلافت کی دیوار گریہ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> خلیفہ صاحب اپنے مریدوں سے یہ توقع کرتے تھے کہ وہ ان کی تعلیم پر اپنا تن من دھن قربان کر دیں گے لیکن جب خلیفہ صاحب کے لئے امتحان کا وقت آیا کہ وہ اپنی عناد انگیز تعلیم کے لئے کیا قربانی کرتے، وہ تو ۱۹۵۴ء میں منیر ٹریبونل کے سامنے اپنی تعلیم کی بنیادی باتوں سے منحرف ہو گئے۔ تکفیر مسلمین سے ارتداد کیا اور اعلان کیا کہ حضرت مسیح موعود کا ماننا جزو ایمان نہیں ہے۔ مسلمانوں کے جنازے میں شرکت کی ممانعت سے بھی منحرف ہو گئے اور ٹریبونل کے سامنے اعلان کیا کہ وہ اس امتناع پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ قریباً نصف صدی سے ارباب پیغام صلح (لاہوری جماعت) کو اس بات پر مطعون کرتے تھے کہ وہ مسلمانوں کو کافر کیوں نہیں کہتے اور ان کے جنازوں میں شرکت کو ممنوع کیوں نہیں سمجھتے۔

بہر حال تحریک ختم نبوت اپنا کام کر کے ختم ہو گئی اور جو بات یہ لوگ کسی عنوان سے ماننے کے لئے تیار نہ تھے اس کو وہ منوا کر گئی۔

اگر وقت گزرنے کے بعد مولوی صدرالدین صاحب امیر جماعت احمدیہ لاہور کے قول کے مطابق قادیانی جماعت کے سربراہوں اور اخباروں نے پھر ٹال مٹول کی روش اختیار کر لی ہو تو اس سے ان کی اخلاقی پوزیشن اور زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ ان کی اور ملت کی حقیقی خیر خواہی کا عنوان بہر حال یہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کا ماننا جزو ایمان قرار نہ دیا جائے اور جس بات کو کرہاً تسلیم کر لیا گیا ہے اسے طوعاً بھی اختیار کر لیا جائے۔

حواشی حوالہ جات

۱۔ ہفت روزہ ایشیا، لاہور، جلد ۹ شمارہ ۸۳۴، ستمبر ۱۹۶۰ء۔
۲۔ ہفت روزہ ایشیا، لاہور جلد شمارہ ۳۲۔ ۷ر اگست ۱۹۶۰ء

بقیہ جنگ اُحد کے تناظر میں

> اللہ نے اسے صرف تمہارے لئے خوشخبری ٹھہرایا اور تا کہ تمہارے دل اس سے اطمینان پکڑیں اور مدد تو اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے ہی ہے۔''

مذکورہ دونوں آیات میں مومنوں کو جنگ میں صبر اور اللہ پر یقین کامل دکھانے کے صلہ میں نصرت الٰہی کا وعدہ دیا گیا ہے۔

جنگ اُحد میں پہلے کامیابی اور ایمان اور فرمانبرداری میں کمی کے باعث یکدم شکست کی صورت حالات اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ جب تک کامل صبر اور کامل یقین کا مظاہرہ نہ کیا جائے تب تک اللہ کی مدد کے وعدے کا عمل ظاہر نہیں ہوتا اور غیبی مدد کے ذریعہ ہی مومن کا دل اطمینان اور یقین سے بھر جاتا ہے۔ اس اطمینان اور یقین کو اس آیت میں اللہ کی بشارت کہا گیا ہے کیونکہ یہ مرتبہ مومن کو صبر آزما مرحلوں سے گزر کر ہی حاصل ہوتا ہے۔ وہ مصائب اور مشکلات کو بدقسمتی یا عذاب نہیں سمجھتا بلکہ وہ ان نامساعد حالات میں زیادہ صبر اور یقین کا مظاہرہ کرتا اور اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اس کو اپنی خاص نوازشات سے نوازتا اور روحانی ترقی عطا فرماتا ہے۔

رسول کریم صلعم کی زندگی میں جتنے بھی غزوات ہوئے ان میں جنگ اُحد ایک ایسا غزوہ ہے جس میں مومنوں کا امتحان ہوا۔ کچھ لوگوں نے جو کمزوری دکھائی اس سے خطرناک نتائج بھی پیدا ہوئے۔ اسی طرح جب مومن اس کمزوری کی حالت کو چھوڑ کر مکمل ایمان اور یقین سے مزین ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ غیر معمولی کامیابی عطا فرماتا ہے۔ یہی کیفیت جنگ اُحد میں ہوئی۔ دشمن کی زیادہ تعداد اور مسلمانوں کی غلطی کی وجہ سے مخدوش حالات کے پیدا ہونے کے باوجود دشمن میدان سے بھاگ کھڑا ہوا اور اللہ کی نصرت اس جنگ میں اس معجزانہ طور پر مسلمانوں کے حق میں ظاہر ہوئی کہ اس کا مظاہرہ کسی بعد کی جنگ میں نظر نہیں آیا۔

***

بلاتبصرہ

لندن انڈر گراؤنڈ بم دھماکوں کے متعلق انگلستان کے علماء کا متفقہ فتویٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ائمہ مساجد اور علمائے کرام کا ایک خصوصی اجلاس بروز جمعہ ۱۵ر جولائی ۲۰۰۵ء بمقام اسلامک کلچرل سینٹر، ریجنٹس پارک، لندن منعقد ہوا جس کے اختتام پر شرکائے اجلاس نے متفقہ طور پر مندرجہ ذیل اعلان کی توثیق فرمائی:

لندن کے تمام شہریوں اور برطانوی عوام کے ساتھ ہم ۷ر جولائی ۲۰۰۵ء کو ان بہیمانہ بم دھماکوں سے دم بخود اور دل برداشتہ ہیں جن کے نتیجے میں ۵۲ معصوم اور قیمتی جانوں کا زیاں ہوا اور سیکڑوں زخمی اور معذور ہوئے اور اس کے ساتھ پورے شہر کا امن اور نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ ہم اس کارروائی کو قطعاً مجرمانہ، کلی طور پر قابل نفرت اور یکسر غیر اسلامی قرار دیتے ہیں۔

اس روح فرسا سانحہ پر اپنی کمیونٹیوں اور اجتماعات کی طرف سے ہم اپنے انتہائی دلی رنج کا اظہار کرتے ہیں اور متاثرہ خاندانوں اور ان کے اقرباء سے تعزیت کرتے ہیں اور جو لوگ زخمی ہوئے ہیں ہم اُن کی سریع صحت یابی کے لئے دعا گو ہیں۔ ہم پوری برطانوی قوم کو، ایک ایسی قوم کو جس کا بحمد للہ ہم خود ایک حصہ ہیں، اپنی ہمدردیاں پیش کرتے ہیں۔

ایک انسانی جان کو بے گناہ تلف کرنے کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم کا واضح فرمان ہے کہ ایک بے گناہ شخص کو مارنا پوری نسل انسانی کو مار دینے کے مترادف ہے اور اسی طرح ایک جان کو بچا لینا ایسا ہی ہے جیسے کسی نے پوری نسل انسانی کو بچا لیا ہو۔ (القرآن ۵:۳۲) یہ ایک اصول بھی ہے اور حکم بھی۔

ہمارا یہ راسخ نظریہ ہے کہ اس طرح بہیمانہ انداز میں انسانی جانوں کے اس طرح تلف کئے جانے کی اسلام میں نہ تو کسی طرح سے اجازت ہے اور نہ ہی اس کا کوئی جواز۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان لوگوں کو جنہوں نے لندن میں بم دھماکے کئے انہیں کسی اعتبار سے بھی شہید نہیں کہا جا سکتا۔

ہم سب کا، مسلمانوں اور غیر مسلموں کا، یہ فرض ہے کہ ہمارے پاس یا ہمارے علم میں ایسی جو کوئی بھی معلومات ہوں کہ جن سے گزشتہ ہفتے کے اس گھناؤنے جرم کا منصوبہ بنانے والوں تک رسائی ہو سکے اور انہیں انصاف کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا جا سکے، ہم اسے حکام تک پہنچائیں۔ گزشتہ ہفتے کے حملوں کے متاثرین کے لئے انصاف کے حصول کی کوشش کرنا از روئے اسلام ہم سب کا فرض ہے۔

اسلام کی راہ درمیان کی راہ ہے اور قرآن کریم مسلمانوں کو امت وسطیٰ قرار دیتا ہے یعنی ایک ایسی کیمونٹی جو درمیانی راہ پر چلتی ہو، انتہا پسندی کی ہر شکل کو کلیتاً اور یکسر مسترد کئے جانے کی ضرورت ہے۔ اس وقت جب کہ دنیا ایک ہیجان میں مبتلا ہے، ہمیں پہلے سے کہیں زیادہ اسلام کے بتائے ہوئے متوازن اور درمیانی راستے پر قائم رہنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے بزرگوں، جوانوں اور بچوں سب کو یہ یاد رکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے مسائل اور دشواریوں کا حل اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور پیغمبر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیش کردہ اسوۂ حسنہ کی تقلید کرنے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے نہ کہ تفریق، تنازع اور مجادلہ کا شکار بن کر۔ اسلام کی سماجی ثقافت کی بنیاد لوگوں کو اچھی چیزوں کی طرف دانشمندی اور خلوص یعنی حکمت و مواعظ حسنہ کے ذریعہ راغب کرنے پر قائم ہے (القرآن ۱۶:۱۲۵)۔ پیغمبر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رحمت بنا کر انسانیت کی رہنمائی کے لئے اس دنیا میں بھیجا گیا تھا اور یہی وہ نمونہ ہے جس کی ہمیں ہمہ وقت تقلید کرنے کی ضرورت ہے۔

جو سانحہ گزشتہ ۷ جولائی ۲۰۰۵ء کو لندن میں پیش آیا وہ ہم سے متقاضی ہے کہ ہم سب اپنی شہری و سماجی اور مذہبی دونوں زندگیوں میں آپس میں متحد ہو کر اسلام فوبیا، نسل پرستی، بے روزگاری، معاشی ناانصافیوں اور سماجی اخراج کا ڈٹ کر مقابلہ کریں کیونکہ یہی وہ عوامل ہیں جن کے نتیجے میں ہمارے کچھ نوجوان معاشرے سے کٹ کر نفرتوں اور مایوسیوں کی دلدلوں میں پھنس جاتے ہیں۔ اسلام برافروختگی اور مایوسی دونوں سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ غصہ اور مایوسی دونوں حرام ہیں اور ان کے نتیجے میں کچھ لوگ دوسرے ایسے لوگوں پر تشدد کے ایجنڈے کا ہدف بن سکتے ہیں جو بدنیتی پر مبنی ہے۔ اس لئے ہم سب کو یعنی خود اپنی کیمونٹی کے افراد کو اور وسیع تر کیمونٹی کو مل کر بہت سا ایسا مثبت کام کرنے کی ضرورت ہے جس سے ہمارے نوجوانوں کی صلاحیتوں اور قوتوں کو خصوصی طور پر ایسی تعمیری راہوں میں استعمال کیا جا سکے جس سے ہمیں اللہ کی رضا حاصل ہو اور معاشرہ بہتری کی طرف گامزن ہو سکے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوانوں کے مسائل کو سمجھا جائے نہ کہ انہیں دشنام کا نشانہ بنایا جائے۔

دنیا بھر میں انسانوں کو جن ناانصافیوں، جس ظلم و تعدی اور جن اذیتوں کا سامنا ہے ہمیں اُس کا شدید دکھ ہے لیکن ہمیں قرآن کریم کی اس

آیت کو بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے، ''اے لوگو! جو ایمان لائے، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے''۔ (القرآن ۵:۸)

ہم بین الاقوامی کمیونٹی کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ وہ دنیا کے اُن گوشوں میں جہاں جنگ و جدل اور تنازعات کی بدولت مسلسل تباہی جاری ہے وہاں پائیدار امن کے قیام کے لئے قدم اٹھائیں تاکہ وہاں محرومیوں اور ناانصافیوں کی وجہ سے تشدد کا لامتناہی سلسلہ ختم ہو۔ ہم میڈیا سے بھی پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ہماری کمیونٹی کے معروف و معتبر علماء کو بدنام کرنے اور اُن کے خلاف بے جا الزام تراشیوں کا سلسلہ بند کرے۔

ہم ایک بار پھر اپنی ایک ایسی شناخت کے لئے کام کرنے کے عزم اور ارادے کا اعادہ کرتے ہیں جو اپنے عقیدے اور برطانوی شہریت کے تحت عائد ہونے والی ذمہ داریوں، حقوق اور رواداری کی درست آئینہ دار ہو۔ آخر میں ہم اللہ سبحانہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ دنیا کے تمام لوگوں کو اپنے رحم و کرم سے نوازے، آمین!

اس اجلاس کا انعقاد مسلم کونسل آف برٹین اور برٹش مسلم فورم اور پورے ملک کی دوسری بڑی قومی و علاقائی تنظیموں کے زیر اہتمام ہوا تھا۔ اعلان پر دستخط کنندگان میں یہ نام شامل ہیں:

شیخ علی ابداش	مسلم کلچرل ہیریٹیج، لندن
ڈاکٹر مناظر احسن	اسلامک فاؤنڈیشن، لیسٹر
مولانا جمشید علی	دی کونسل آف ماسکس، ٹاور ہیملیٹس
مفتی محمد اسلم	جمیعت علمائے برطانیہ
خطیب محمد اقبال اعوان	یوکے اسلامک مشن، لوٹن
خطیب محمد عظیم	کشمیر فورم، یوکے
مفتی برکت اللہ عبدالقادر	سینئر امام، مسجد فنچلے
امام درس بومزوغ	امام، مراکن مسلم کمیونٹی آف لندن
امام عبدل چودھری	برٹش مسلم ایکشن فرنٹ
مولانا عبدل چودھری	دی کونسل آف ماسکس، ٹاور ہیملیٹس
شیخ احمد دادھور	مسلم کلچرل ہیریٹیج سینٹر، لندن
ڈاکٹر احمد دوبیان	اسلامک کلچرل سینٹر اینڈ لندن سینٹرل ماسک
ڈاکٹر عبدالشہید الاہسال	مسلم ایسوسی ایشن آف برٹین
شیخ مصلح الدین فراضی	اسلامک فورم، یورپ
شیخ راشد غنوشی	اسلامک فورم، یورپ
مولانا مودود حسن	علماء کونسل آف دعوت اسلام
شیخ صہیب حسن	اسلامک شریعہ کونسل
ڈاکٹر اسامہ حسن	امام، مسجد التوحید، لیٹن
مولانا محمود الحسن	دعوت الاسلام
حافظ شمس الحق	امام، اشاعت الاسلام مسجد، اِلفورڈ
حافظ مولانا شمس الحق	دی کونسل آف ماسکس، کاؤر ہیملیٹس
حافظ مولانا ابوچنار خالد	انٹرنیشنل مسلم کمیٹی
ڈاکٹر عبدالکریم خلیل	مسلم کلچرل ہیریٹیج سینٹر، لندن
مولانا مسعود عالم خان	جامعہ اسلامیہ، برمنگھم
شیخ ہوکے مجولی	مسلم ویلفیئر ہاؤس ٹرسٹ
پروفیسر سید فاضل ملانی	انٹرنیشنل کالج فار اسلامک اسٹڈیز
پروفیسر احمد شیخ محمد	مسلم ایسوسی ایشن آف برٹین
پروفیسر حسن معین الدین	دعوت اسلام، یوکے اینڈ آئرلینڈ
مولانا گل محمد	برٹش مسلم فورم
مولانا فاروق ملا	لنکن ماسک
پروفیسر داؤد نوبھی	امام نائیجیرین مسلم کمیونٹی، اولڈ کینٹ روڈ ماسک
مولانا محمد امداد حسین پیرزادہ	جامعہ الکرم، ناٹنگھم
مولانا بوستان قادری	کنفیڈریشن آف سنی ماسکس، مڈلینڈز
شیخ عبدالقیوم	امام، ایسٹ لندن ماسک
مولانا محمد شاہد رضا	امام دی ورلڈ اسلامک مشن اینڈ
مولانا سید محمد سبزواری	العصر کمیونٹی اینڈ ایجوکیشن سینٹر
مولانا اسمٰعیل علی شاہ	جمیعت علماء برطانیہ
مولانا محمد اکرم خان	یوکے اسلامک مشن، لوٹن

دیگر علماء کی طرف سے جن میں ڈاکٹر مشرف حسین، کریمیہ انسٹیٹیوٹ، ناٹنگھم اور مولانا اسماعیل، برمنگھم سینٹرل ماسک شامل ہیں اس مجلس کے انعقاد اور اُس کے اعلان کے سلسلے میں حمایت کے پیغامات موصول ہوئے ہیں۔

***

جرمنی میں برلن مسجد کے باہر ناصر احمد صاحب، فولکر نیف صاحب (مترجم) اور ہمارے نہایت پرجوش نوجوان اور مسجد کے نگران محمد علی صاحب۔
ناصر صاحب نے عیدالضحیٰ اور جمعہ کا خطبہ دیا اور برلن کارپوریشن کی طرف سے اعلان کردہ Open Day کے موقع پر زائرین سے ملاقات کی۔
زائرین سے محمد علی صاحب اور فولکر نیف صاحب نے اسلام کے بارے میں لوگوں سے گفتگو کی اور انہیں مسجد کی تاریخ سے آگاہ کیا۔

برلن مسجد کو دیکھنے کے لیے اکثر افراد اور گروپ آتے رہتے ہیں۔ نومبر 2005ء میں برلن کی ایک مزدور تنظیم کا وفد آیا۔ یہ تصویر اس موقع پر لی گئی تھی۔

Printed at: HEN Printers, 93-Calcutta Road No. 4, Freeport, Trinidad (West Indies)